

الکاسانی بیات و علمی خدمات

سید عبد الرحمن بخاری

اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ایسی باکمال شخصیات ابھرتی رہی ہیں جنہوں نے زمانے کی عام روش سے ہٹ کر اپنا جادہ عمل خود تراشا اور علمی یا عملی سطح پر تہذیب اسلامی کے اس شعبے کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا جس کی طرف سے غفلت برتی جا رہی تھی۔ ایسی ہی تاریخ ساز شخصیتوں میں ایک علاؤ الدین ابو بکر بن مسعود بن احمد الکاسانی ہیں جن کی علمی خدمات کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ پانچویں صدی ہجری کے نصف آخر میں امت مسلمہ جس نئے اور انقلابی نظام تعلیم و تربیت کی نیواٹھارہی تھی اس کی آبیاری کے لیے قدرت نے علماء مصنفین اور مدرسین کا جو سہ اول دستہ تیار کیا تھا ملک العلماء کاسانی کو اس میں امتیازی اور قائدانہ مقام حاصل ہے۔

کاسانی کے علمی و اصلاحی مزاج کو سمجھنے اور ان کی فکری و عملی جدوجہد اور انقلابی روش کی افادیت اجاگر کرنے کے لیے اس عہد کی سیاسی اور تمدنی حالت کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے کاسانی نے چھٹی صدی ہجری مطابق بارہویں صدی عیسوی کا زمانہ پایا جو اس لحاظ سے بڑا پر آشوب اور پر از واقعات دور ہے کہ اگر ایک طرف سیاسی اضمحلال، تمدنی انحطاط اور فکری اختلال کا آغاز ہے تو دوسری طرف علمی تحریک کا نقطہ تحول و انقلاب اور تیسری جانب احیاء اسلام اور ملی تشخص کی بحالی کے لیے ہر شعبہ حیات میں تجدیدی خدمات انجام دینے والی بیسیوں مائے ناز ہستیوں کے وجود سے درخشاں عہد ہے۔ ذیل میں اس عہد کی علمی، تمدنی اور سیاسی حالت کا ایک اجمالی سا

خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

سیاسی نکتہ وادبار: پانچویں صدی ہجری کے آخر میں دنیا نے اسلام کے سیاسی زوال کا عمومی دور شروع ہو چکا تھا اگرچہ بظاہر اسلامی سلطنتوں کے اقتدار کا سلسلہ اندلس سے ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا مگر اندرونی طور پر حالات نہایت خراب اور ناگفتہ بہ تھے۔ عالم اسلام میں مرکزی خلافتوں اور بلیسیوں چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں تقسیم تھا جن کے باہمی سیاسی تعلقات منقطع ہو چکے تھے۔ خلافت بغداد کا شیرازہ بکھر چکا تھا سلجوقی اور دیگر ماتحت سلطانین خانہ جنگیوں میں مبتلا تھے۔ جس سلطان کی طاقت بڑھ جاتی بغداد میں اسی کا خطبہ شروع ہو جاتا۔ اندلس میں اموی خلافت کی مرکزی حیثیت ختم ہو چکی تھی یورپ کی عیسائی حکومتیں مروج کی تاک میں تھیں کہ مسلمانوں کو ختم کر کے اپنی حکومت قائم کریں۔ افغانستان و ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں محمود غزنوی کے جانشینوں کا زوال شروع ہو چکا تھا اور ہندو راجے مہاراجے اپنی سابقہ شکتیوں اور ذلتوں کا انتقام لینے کے لیے صلاح مشورے کر رہے تھے۔ مصر میں سلطنت باطنیہ، فاطمیہ جے سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں دولت جہنم کے نام سے پکارا ہے الحاد اور بے دینی کے نظریات پھیلاتے اپنے انجام بد سے قریب تر نہ ہو چکی تھی غرض ہر طرف ایک ہولناک انتشار اور طوائف الملوک کی کا دور دورہ تھا۔ اور نکتہ وادبار کے منحوس سائے ملت اسلامیہ پر پھارے تھے۔ خود کاسانی کا شہر اقامت حلب پیغم سیاسی انقلابات، چیپٹلشوں اور سازشوں کا مرکز بنا سوا تھا شام و حلب کے حکمران مسلسل تباہ کن خانہ جنگیوں کے بعد اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ فرنگیوں کے اس حملے کا مقابلہ نہ کر سکے جو صلیبی جنگوں کا نقطہ آغاز بنا چنانچہ بیت المقدس پر قبضہ کر لینے کے بعد صلیبی عسا کر عراق و حجاز پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگے یوں مسیحی دنیا کی متحدہ قوت اسلام اور مسلمانوں کو مٹا دینے پر تلی ہوئی تھی۔ یہ تمام الم انگیز واقعات کاسانی کی نگاہوں کے سامنے گزر رہے تھے ان کا مادی وجود خواہ ان واقعات سے علیحدہ اور دور رہا ہو لیکن تمام دیگر حساس اور پرسوز دلوں کی طرح اپنے شعور و احساس کے ساتھ وہ بھی اس آگ میں جل رہے تھے اور اس سوز و رولوں نے انہیں پوری ہمت و قوت اور خلوص کے ساتھ اسلام کو بطور ایک نظام مدنییت کے زوال و انحطاط

کی ان ہر لمحہ پھیلتی گھاٹوں سے بچانے اور تہذیب اسلامی کے علمی اور شرعی سرمائے کو محفوظ رکھنے کے لیے مصروف عمل کر دیا۔

تمدنی انحطاط اور زوال سیرت: بنا کرتا ہے چنانچہ چھٹی صدی ہجری میں سیاسی انحطاط کے

پہلو بہ پہلو تمدنی اور سماجی ادارے بھی ضعف و انحلال کا شکار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جملہ معاشرتی اداروں کے ارکان کا طرز عمل ضبط و انقیاد سے نکل کر انحراف کی راہ پر پل پڑتا تھا۔ عوام پر دنیا دارانہ زندگی کا رجحان غالب ہو گیا تھا معاشرہ میں طبقاتی تقسیم، گروہی امتیازات اور قبائلی عصبیت و منافرت نے عام سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی میں انتشار و افتراق کے مہیب سائے پھیلا دیئے تھے خلافت عباسیہ اور دیگر سلطنتوں کے ضعف و انحطاط نے عقلی بے یقینی کی فضا کو جنم دیا کیونکہ آزادی پسندا و معتدروں نے طبقہ محکوم اور تقویٰ شکن طبقہ مقتدر و حاکم بن بیٹھا، عوام سے اطاعت کے مطالبہ کا جذبہ محکمہ بیہودہ عوام کی بجائے ہوس اقتدار بظہر ا۔ امراء و سلاطین مصلحتوں کے ساتھ ساؤ کاری کرنے لگے علماء کا شیوہ بھی ایسا ہی شاہ پرستانہ ہو گیا۔ عقیدہ، علم اور عمل میں باہمی سازگاری ختم ہو گئی کہ فقہاء نے حریت پرستی کو اپنا لیا عوام کے اندر احکام شرعیہ کی بجا آوری میں اخلاص عمقا ہو گیا اور لفظ قانون کی پیروی پر اکتفا کر لیا گیا تو ہر گیز زوال سیرت کا آغاز ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اس زوال سیرت کے اثرات انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں پھیلتے چلے گئے تا آنکہ علماء اور مصلحین کی ایک جماعت اس احساس سے سرشار ہو کر کہ امت کو زوال سیرت سے نکالا جائے علم و عمل کے ہر میدان میں مصروف کار ہو گئی۔

فکری انتشار اور لادینی افکار کا فروغ: زوال و انحلال کا دور تھا۔ یونانی فلسفہ اور علوم کے

کے فروغ سے اسلامی دنیا میں عقلیت اور مادیت کا ایک طوفان آگیا تحریک اعتزال اسلام میں مادیت اور عقلیت محض کی نمائندہ تحریک تھی جو مسلمانوں کے عقائد میں تہذیب، ایمان میں شک اور ذہن میں خلش ابھار رہی تھی اس عقلیت کے ساتھ ساتھ ”وضعیت“ کا طوفان بھی آنا ناگزیر میر تھا وضعیت کا سب سے برا اثر یہ ہوتا ہے کہ مذہب کی آواز دل تک نہیں پہنچتی اور جب دل ہی

متاثر نہ ہو تو مذہب کی حقیقی روح سے آشنا ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس عقلیت و وضعیت کے مہلک اثرات نے مسلمانوں کی دینی زندگی کے کسی گوشے کو نہیں بخشا اور سطوے کے کلیات، دین کے محکمات پر حکم بننے لگے، محبت و ذوق کی آگ ٹھنڈی ہونے لگی اور نیکی کا تصور مضحک اور متغیر ہونے لگا۔

عہد کاسانی میں ایک طرف عقلیت و اعتزال کا یہ فتنہ عروج پر تھا تو دوسری طرف باطل تصورات اور لادینی نظریات کا فروغ عام تھا مگر کی فاطمی سلطنت کے زیر اثر شیعہ اور باطنی رجحانات روز بروز زور پکڑتے جا رہے تھے تو اسلامی خلافت کی سیاسی کمزوری کے باعث عیسائیت اسلام پر حملہ آور ہو چکی تھی اور اس طرح علمی، فکری اور معاشرتی طور پر اسلامی دنیا میں عیسائیت کے افکار و معتقدات پھیل رہے تھے۔

ان مذکورہ عقلی و مذہبی فتنوں کے ساتھ ساتھ تصوف کی تحریک بھی ایک انتہا پسندانہ انداز اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اقبال رقمطراز ہیں: تصوف مذہبی حیثیت سے فقہاء کی دوراں کار موٹو گائیوں کے خلاف ایک رد عمل تھا عقلی حیثیت سے تصوف عقلیت اور آزاد خیالی کا حامی ہو گیا فقہاء کی ظاہر پرستی سے بیزار ہو کر صوفیاء نے ظاہر و باطن کے امتیاز پر اس قدر زور دیا کہ شریعت کے ظاہری پہلو کی طرف سے تغافل نمودار ہو گیا اور باطن میں غوطہ زنی صوفیاء کو عالم محسوسات سے دور لے گئی اور اسلامی مملکت اور تہذیب و تمدن ادنیٰ درجے کے لوگوں کے ہاتھ آکر تغیر و ترقی سے محروم ہو گئے، اہل یوں عہد کاسانی ہمیں شریعت و طریقت کی چمقلش اور صوفیاء فقہاء کی آویزش کا عہد نظر آتا ہے جس کے منفی اثرات سوسائٹی کی مجموعی علمی اور عملی زندگی پر مرتب ہو رہے تھے ان بگڑے ہوئے حالات میں ایسے عالی ہمت اور اولوالعزم اشخاص کی ضرورت تھی جن کی قوت و بصیرت کی حدود علمی موٹو گائیوں، فلسفیانہ توجہیوں اور فقہی نکتوں پر ہی پھیلی ہوں نہ ہوں بلکہ ان میں عشق و سستی اور معرفت و آگہی کی وہ برقی لہریں بھی موجزن ہوں جو مردہ دلوں کو زندگی بخشی اور طاغوتی طاقتوں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہیں چنانچہ قدرت نے اس دور میں عزرائلی، غوث اعظم جیلانی، ابن رشد، الکاسانی، ابن الجوزی، الشیرازی، ابن العربی اور قاضی خان ایسے بیسیوں

بالکمال نفوس قدسیہ کا انتخاب کیا جنہوں نے ایک طرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی وراثت کو سنبھالا اور علوم و مسائل میں اپنی فکر تازہ اور مجتہدانہ قابلیت سے کام لے کر مسلمانوں میں نئی علمی روح اور ذہنی بیداری پیدا کر دی تو دوسری طرف اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت اے غرضتی و ایشاد اور اپنی اعلیٰ دماغی و قلبی صلاحیتوں سے اسلام کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دی اور اس کے پیروکاروں میں نیا اعتماد، جوش اور قوت عمل پیدا کر دی۔

اسلام ایک عقلی و علمی دعوت ہے جس کا مبداء و منشاء علم ہے
علمی و فقیہی ارتقاء اور عہد کاسانی؛ بقول اقبال: اسلام کا ظہور استقرائی عقل کا ظہور ہے چنانچہ
 اسلام میں علم کو غیر معمولی بلکہ فوق الکل اہمیت حاصل ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رفاہ عامہ کی خاطر بے عرض حصول علم اور بے لوث اشاعت علم کو بے حد سراہا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر علم کی ایک آفاقی تحریک ابھری جو دنیا کی سب سے بڑی علمی تحریک قرار پائی یہ تحریک انہی راستوں پر آگے بڑھی جو مسلمانوں نے اپنے دینی منبع قرآن کریم کے مطالعہ اور احکام الہی کی پیروی میں اختیار کیے اور قرآن ہی کے عظیم اصولوں کے مطابق اس نے عالمگیر اثرات پیدا کیے اور باوجودیکہ اندرونی فتنوں اور بیرونی حملہ آوروں نے بار بار اس تحریک کو تہ دبا لیا مگر قرآن اور سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے گہرے نفوذ کی وجہ سے یہ تحریک ہر بار خود کو از سر نو منظم کرنے میں کامیاب ہو جاتی رہی۔ یورپ کے مستشرقین اسلامی تاریخ کا مطالعہ کر کے انکشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ مسلمانوں کا سیاسی زوال کبھی ان کے دینی اور علمی نظام کو تباہ نہ کر سکا بلکہ بقول پروفیسر ہٹی اکثر ایسا ہوا کہ سیاسی اسلام کے تاریک ترین لمحات میں مذہبی اور علمی اسلام نے بعض نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کیں، ہالینڈ کے ایک فاضل Fred Lokke Gaard نے وہ انداز میں اس پر استعجاب کا اظہار کیا ہے کہ، گو اسلام کا سیاسی زوال بارہا ہوا لیکن روحانی اور علمی اسلام میں ترقی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا، اس کی وجہ ہمیشہ یہ رہی کہ مسلمانوں کی ملی زندگی میں جب کوئی

لہ اقبال: تشکیل جدید الہیات اسلامیہ

لہ ہسٹری آف عربز، ص ۲۲۵ -

شکل مقام آیا علماء اور مصلحین کی ایک ایسی جماعت سامنے آگئی جس نے بصیرت و سہمت کے ساتھ نامساعد حالات کا مقابلہ کیا اور اسلام کی عظمت و سر بلندی اور ملی تشخص کی بحالی کے لیے تجدید و احیاء کی تدابیر اختیار کیں۔

فاضل روزتال نے اپنی کتاب **Knowledge Truimphanl** میں خراج تحسین ادا کرتے ہوئے لکھا ہے: "اسلام نے علم پر اتنا ہمہ جہت زور دیا ہے کہ اس کے زیر اثر قرون وسطیٰ کی اسلامی تہذیب و ثقافت نے بڑے بڑے علماء اور مفکرین پیدا کیے، یہ اسلامی تہذیب کا ایسا کارنامہ ہے جس کی فیض رسانی سے عالم انسانیت تاابد مستفید ہوتا رہے گا اور عالم کو جو مرکز ہی اہمیت اسلامی تہذیب نے دی ہے اس کی نظیر کسی اور تہذیب میں نہیں ملتی لہٰذا علم کا سانی میں یہ علمی تحریک عروج و کمال کی منزلیں طے کر چکی تھی کہ عباسی عہد عروج میں بیت الحکمت کا قیام اور یونانی و خارجی علوم کی اشاعت، نیز تصوف کے مختلف دہستانوں کے ظہور کی وجہ سے اور فقہ و عقائد کی تدوین کے باعث علم کی ماہیت، اس کی تحصیل و تعلیم کے طریق کار اور غایات و اقسام کے بارے میں تمام بنیادی تصورات و نظریات فروغ پا چکے تھے علوم عربیہ، علوم شرعیہ، کلام، تصوف و اخلاق اور تاریخ وغیرہ کی باقاعدہ تدوین ہو گئی تھی تدریس کے سلسلے بھی منظم ہو چکے تھے اور علم کے مختلف فروغ اور اہم تر اعمی مسائل پر باقاعدہ کتابیں بھی سامنے آچکی تھیں چنانچہ اس دور میں علم کی اشاعت برابر ترقی پر تھی۔ بہر فن کے ماہر اساتذہ، مایہ ناز مفکر اور قوی الاستعداد عالم موجود تھے بڑے بڑے تعلیمی حلقے، تدریسی ادارے اور کتب خانے قائم تھے جن میں اطراف عالم کے طلبہ علوم دینیہ اور علوم عقلیہ کی تعلیم پائے تھے۔ بہر فن میں بڑی بڑی جلیل القدر کتابیں تصنیف ہو رہی تھیں لیکن چند شخصیتوں اور علمی کارناموں کو مستثنیٰ کر کے اس دور کے علم اور تصنیف و تالیف میں وسعت زیادہ اور عمق و گہرائی کم تھی۔ غرور و تکبر کی بجائے نقل و اقتباس کا ذوق غالب تھا۔ دماغ تھکے تھکے اور طبیعتیں سبھی سبھی سی نظر آتی تھیں۔ سینکڑوں

ناموں میں سے ایک ایسے شخص کا ملنا مشکل ہے جس پر عبقری کا اطلاق درست ہو جس نے کسی موضوع پر نئی چیز پیش کی ہو یا کسی خاص علم و فن میں کوئی نگراندرا ضاڈ کیا ہو۔
 باقی ہیں فقہی سرگرمیاں تو سیاسی اضمحلال اور فکری و تمدنی انحطاط کے زیر اثر فقہ میں آزادی و استقلال کی روح ضعیف ہو گئی اور اس کے بدلے علماء اور عوام سبھی پر تقلید محض کی روح چھا گئی۔
 اجتہاد مستقل کا دروازہ بند ہو گیا اور فقہاء جمہور کا شکار ہو گئے۔
 صبحی محضانی لکھتے ہیں۔

ثم نقهرت المدينة العربية شيئا فشيئا واصابها الجمود
 في جميع نواحيها فاستتبع ذلك تغشى التقليد وتوقف الاجتهاد في الفقه ٤
 یعنی پھر عربی تمدن کو تدریجاً ادا بار آ گیا اور ہر طرف جمود چھا گیا اس سے تقلید پھیل گئی اور
 فقہی اجتہاد کو گھٹا اس فقہی جمود اور بندش اجتہاد کے بہت سے اسباب بیان کیے گئے ہیں جن میں

لہ الخضری: تاریخ التشريع الاسلامی، عربی، ص ۳۳۲۔

لہ محضانی: فلسفۃ التشريع فی الاسلام، ص ۳۶

لہ یہ جمود بحیثیت علم و فن فقہ اسلامی کا وجود نہیں بلکہ دراصل فقہاء کا جمود تھا جو وقتی طور پر فقہی جمود کا روپ میں عقیدہ تقلید سے
 تقویت پا کر مسلم معاشرے میں سرایت کرتا چلا گیا تا آنکہ یہ سمجھا جانے لگا کہ چونکہ فقہ اسلامی کے جدا امکانات اپنی
 فقہاء کے ہاتھوں میں ہیں اس لیے فقہاء کا جمود فقہ اسلامی کا جمود ہے مگر وہ حقیقت یہ ہے کہ ایک علم و فن کی حیثیت
 سے فقہ اسلامی کے امکانات زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہیں اور اس کے اصول و کلیات اور اجزائے ترکیبی میں ثبات
 و تغیر دونوں عنصر متوازن حیثیت میں موجود ہیں اگر فقہ کی اساس یعنی اجتہاد کا جو از مسلم اور عصری تقاضوں سے اس کی
 ہم آہنگی کی ضرورت کا احساس بلکہ یقین موجود ہے تو فقہ اسلامی جمود کا شکار نہیں ہو سکتی۔ بناء بریں فقہی جمود اور فقہاء کے
 بودی باریک تفریق و تقسیم ناگزیر ہے اور یہ تفریق دینا ضروری ہے کہ ہر بندش اجتہاد کی بنیاد دراصل فقہاء کا جمود ہے نہ کہ
 فقہ اسلامی کا جمود علامہ فرید وجدی پر بھی طور پر لکھتے ہیں: لما طرأ علی المسلمین الجمود الاجتماعی و
 تولد لهم القصور علی فهم اسرار شریعتهم ستروا ذلک القصور بدعوی انسداد
 باب الاجتهاد والحقیقة انه مفتوح بنص الكتاب و السنة الی یوم القیامة۔

فقہاء مابعد کی عصری تقاضوں سے روگردانی و گزروہ بندی اور مسلمانوں کے سیاسی اور فکری و اخلاقی انحطاط کے علاوہ اہلیت اجتماع کے فقدان، انا اہل مافراد کے دین سے تلاءب اور حکمرانوں کی فقر سے بے رغبتی کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

ان فرض عہد کاسانی میں دیگر علوم و فنون کی طرح فقہ اسلامی میں بھی آزادی و استقلال کی روح منقود ہوتی جا رہی تھی اور فقہاء کی علمی و اجتماعی اور تصنیفی و تدریسی کاوشوں پر نقل و اقتباس تقلید و ظاہریت اور تعطل و جمود کی کیفیت طاری ہو چکی تھی

الکاسانی — مختصر سوانحی خاکہ

اسلامی تاریخ کا ایک المیہ یہ ہے کہ مؤرخین نے شاہی خاندانوں کے عروج و زوال کی داستانوں میں خود کو کچھ اس طرح گم کر دیا کہ ان کے نزدیک تاریخ صرف دربار شاہی اور میدان جنگ ہی سے عبارت ہو کر رہ گئی ہے۔ مذہبی تذکرہ نویسوں اور علمی سوانح نگاروں نے اسلاف کا تذکرہ کچھ اس انداز سے لکھا کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے معماروں کے حقیقی خد و خال ہی علمی مناظروں اور تدریس و افتاء کی مجمل حکایتوں اور خرد راق و کرامات کی چند بے معنی داستانوں میں پھپھ کر رہ گئے۔ چنانچہ ماحول کے صحیح تناظر میں ان کی تہذیبی خدمات کو دیکھا جاسکا نہ انسانیت کی سطح پر ان کی علمی و کرداری بلندی کا اندازہ لگایا جاسکا۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ان معماران ملت کے حالات و خدمات کا بہی نوع انسان اور ملت کی ضروریات کے آئینہ میں تفصیلی جائزہ لیا جائے تاکہ ان کے صحیح خد و خال ابا اگر ہو سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بہ حیثیت ایک علمی اور مذہبی تحریک کے اسلام کا مطالعہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کے بعد انہی نفوس قدسیہ کی حیات طیبہ کے گرد گھومتا ہے اس طرح علماء کرام اور صوفیاء عظام اسلام کی دینی اور ملی تاریخ کا جزو لاینفک ہو کر رہ گئے ہیں ان کی سیرت کے مطالعہ کے بغیر نہ صرف اسلام کی مذہبی تاریخ میں ایک خلاء پیدا ہو جاتا ہے

بلکہ اسلام کے دینی اور فکری و تہذیبی نشوونما کا صحیح مطالعہ ہی ناممکن بن جاتا ہے۔ مگر ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تاریخ کی کتابیں بڑے بڑے سلاطین سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے حکمرانوں اور والیان ریاست بلکہ امراء اور وزراء و اعیان سلطنت تک کے حالات اور واقعات زندگی پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی جنگوں اور خانہ جنگیوں تک کے واقعات اور جزئیات بھی پوری وضاحت سے بیان کرتی ہیں لیکن تہذیب و تمدن کے بڑے بڑے معماروں اور امت کی فکری و دینی قیادت اور رہنمائی کرنے والے علماء کرام، فقہاء عظام اور صوفیاء کرام کی سیرت و سوانح کے بارے میں بڑی معنی خیز خاموشی اور سکوت اختیار کر لیتی ہیں اور اگر برسبیل تذکرہ کسی عالم فقیر یا سنی کا نام آہی جائے تو صرف ایک سرسری سا اشارہ کر کے آگے گزر جاتی ہیں۔ ہمارے مددح ملک الملک علاء الدین ابوبکر الکاشانی بھی اسی تائیدہ پائیز غفلت اور بے اعتنائی کا شکار ہیں کس قدر جلیل القدر علمی اور فقی شخصیت ہے مؤرخین اور سوانح نگاروں کے کتنے بڑے تغافل اور تساہل کا شکار ہو کر آئندہ نسلوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ گئی ہے؛ اور تو اور طبقات الخفیر پر لکھنے والے مصنفوں اور اعلام کے تذکرہ نگاروں کے لیے بھی ملک العلماء کی ذات صرف اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے کہ دو چار سطریں یا نیا دہ سے زیادہ ایک آدھ صفحہ لکھ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اس انسو سناک روش کی وجہ ہمیں معاصرانہ رقابت اور اس کے سلبی اثرات تو نہیں؛ یہ ایک سوال ہے جس پر حال کے مؤرخین، سوانح نگاروں اور تہذیبی ارتقاء کا جائزہ لینے والوں کو سنجیدگی سے غور کرنا ہو گا۔

ابوبکر بن مسعود بن احمد الکاشانی، جنہیں غلطی سے الکاشانی بھی کہا جاتا ہے۔ علاء الدین اور ملک العلماء کے لقب سے ملقب تھے۔ ان کی نسبت کا سان سے ہے جو فرغانہ میں دریائے سیحون کے شمالی نچبے الشاش سے پیرے واقع ہے۔ تاریخ ولادت کا ہمیں ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی ان کے سوانحی تذکروں میں کوئی ایسا واضح قرینہ دستیاب ہو سکا جس سے ان کی عمر یا تاریخ پیدائش کا

اندازہ لگاجاسکے تاہم ان کی تاریخ وفات ۱۰ رجب ۸۷۷ھ طے شدہ ہے جس کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ الکاسانی چھٹی صدی ہجری کے اوائل یا پانچویں صدی کے بالکل اواخر میں پیدا ہوئے۔

علمی شخصیات کی تشکیل میں اساتذہ بڑا بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اور اس اعتبار سے الکاسانی کی خوش سنجختی قابل رشک ہے کہ انہیں اپنے وقت کے عظیم فقیہ علاؤ الدین محمد بن احمد بن ابی احمد السمرقندی سے بھرپور استفادہ کا موقع ملا اور اگرچہ آپ کے اساتذہ میں ابوالعین میمون مکولی اور محمد الائمہ سرنگی کے نام بھی ملتے ہیں تاہم فقہ کی تعلیم زیادہ تر محمد بن احمد السمرقندی ہی سے حاصل کی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ الکاسانی کی شخصیت اور فکر و اسلوب پر السمرقندی کی گہری چھاپ نظر آتی ہے علامہ کاسانی اپنی خداداد صلاحیتوں، بلند ہمتی اور مسلسل محنت کے ذریعہ بہت جلد اپنے معاصر علماء و فقہاء سے سبقت لے گئے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کم نظروں کی طرف سے حسد و رقابت کا محروض بن گئے خود کہتے ہیں سے

سبقت العالمین الی المعالی بصائب فکرة و علوہ

و کلا ح بجمکتی نوری الہدای فی لیال بالضلالة مد لہمة

یرید الجادون لیطغوہ فیابی اللہ الا ان یتمہ (۲)

تاہم الکاسانی کی اعلیٰ ذہانت و فطانت، علمی بصیرت اور فکری اصابت سے ان کے استاد علاؤ الدین السمرقندی اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی انتہائی تڑپ، عالمہ و نقیہ بیٹی فاطمہ جو بے پناہ ظاہری جمال و رعنائی کے ساتھ ساتھ علم و تقویٰ کے اعتبار سے اس مقام رفیع پر فائز تھیں کہ ایک دیے میں فتویٰ کا دران پر ہو گیا تھا۔ سے علامہ کاسانی کی شادی کر دی اور ان کی کتاب بدائع الصنائع کو تحفہ عروسی (مہر) قرار دیا، الجواب المفیئذ وغیرہ کی تصریح یہ ہے کہ:

وزوجہ شیخہ بنتہ الفقیہة العالمة... وسیب تزویجہ بابتہ

شیخہ انہا کات من حسان النساء وكانت حفظت التحفة تصنیف والدها وطلبها عما
 من ملوک بلاد الروم فامتنع والدها فجاء الکاسانی ولزم والدها واشتغل علیه
 ویرع فی علما الاصول والفروع وصنف کتاب الیdale وهو شرح التحفة
 وعرضه علی شیخه فآزاد فرحایه وزوجه ابنته وجعل مهرها منه لہ

یعنی علامہ سمرقندی کی بیٹی فاطمہ حسن وجمال میں یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ عالمہ اور فقیہہ بھی
 تھی اپنے والد کی تصنیف تحفۃ الفقہاء کی حافظ تھی۔ بلادِ روم کے کئی شاہوں نے اس سے شادی کی
 درخواست کی مگر سمرقندی نے انکار کر دیا پھر جب ابو بکر الکاسانی آئے اور علامہ سمرقندی سے حصول علم
 وقیض میں مشغول ہو گئے اور علم اصول و فروع میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اپنے شیخ کی
 تصنیف تحفۃ الفقہاء کی شرح بدائع الصنائع کے نام سے لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کی تو علامہ سمرقندی
 بہت خوش ہوئے اور اپنی دختر فاطمہ کا ان سے نکاح کر دیا اور کتاب بدائع کو مهر قرار دیا۔

علامہ کاسانی نہایت وجیرہ شجاع اور خود دار عالم دین تھے۔ ابتداء میں وہ سلجوقی دربار سے
 وابستہ تھے لیکن ایک بحث کے دوران حمیت مذہبی کی بناء پر فریق مقابل کو سرزنش کرنے کے بعد
 دربار سے اپنا تعلق منقطع کر لیا ہوا یوں کہ بلاد روم کے فقیہ سے مسئلہ تصویب مجتہد پر مناظرہ ہوا وہ
 فقیہ لاعلمی کی بناء پر اس امر پر مصر تھا کہ امام ابوحنیفہؒ ہر مجتہد کو مصیب قرار دیتے ہیں۔ علامہ کاسانی
 اس کی فکری لغزش پر تنبیہ کرتے رہے اور بار بار صحیح حوالوں سے بتاتے رہے کہ امام صاحب
 کا موقف یہ ہے کہ حنق واحد ہے اور ایک مسئلہ کے دو متضاد احکام میں ایک ہی رائے صاحب
 ہوگی اس کے برعکس ہر مجتہد کی تصویب معتزلہ کا موقف ہے وہ فقیہ اپنی غلط رائے پر بہت دھرمی
 سے بھارے اور تلخ کلامی پر اتر آیا تو علامہ کاسانی نے غیرت مذہبی اور احقاق حق کی شدید احتیاط میں اس
 کی سرزنش کر دی اور دربار سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔ اس واقع کے بعد سلجوقی حکمران نے اپنے وزیر
 کے مشورے سے علامہ کاسانی کو حلب میں نور الدین زنگی کے دربار میں سفیر بنا کر بھیج دیا جہاں ان کا
 بڑی تعظیم و تکریم سے خیر مقدم کیا گیا تھے

بعد ازاں نور الدین زنگی نے علمائے حلب کی درخواست پر علامہ کاسانی کو رضی الدین السرخسی کے بجائے مدرسۃ الخلاویہ میں معلم کی حیثیت سے مأمور کر دیا۔ ابن قطلوبغا اور طاش کو پسر و زادہ کا بیان ہے کہ انہیں یہ منصب تدریس السرخسی کی وفات کے بعد ملا لیکن دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار نے ابن العدیم کی تاریخ حلب کے حوالے سے لکھا ہے کہ علامہ کاسانی کو رضی الدین السرخسی کی جگہ ان کی زندگی ہی میں منصب تدریس پر مقرر کیا گیا کیونکہ طلبہ السرخسی سے قوت بیان میں ایک نقص کی وجہ سے بہت غیر مطمئن تھے ۲

اس رائے کی طاش کو پسر و زادہ کے اس بیان سے بھی ہو جاتی ہے کہ نور الدین نے السرخسی کو ایک غلطی کی بناء پر مدرسہ الخلاویہ کی تدریس سے معزول کر دیا تھا اور وہ دمشق جا کر مدرسہ الخاتونہ میں معلم کی حیثیت سے فرائض انجام دینے لگے ۳ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ کاسانی کو مدرسۃ الخلاویہ میں منصب تدریس السرخسی کی معزولی کے بعد ان کی زندگی ہی میں مل گیا تھا۔ مدرسۃ الخلاویہ کے طلبہ علامہ کاسانی سے بہت خوش تھے اور ان سے حصول علم کے اس قدر شائق تھے کہ بقول القرشی اپنے استاد کاسانی کے لیے سجادہ بچھا کر سارا سارا دن ان کا انتظار کرتے رہتے یاں تک کہ وہ آجاتے اور درس دیتے تو نہایت سکون و اطمینان سے طلبہ پڑھتے ۴

ابن العدیم نے احمد بن یوسف الانصاری کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ علامہ کاسانی نے ایک موقع پر اپنی اہلیہ کے مشورہ سے حلب سے واپس اپنے وطن روم کی جانب لوٹنے کا ارادہ کر لیا نور الدین کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے آپ کی اہلیہ کے پاس ایک خادمہ کو بھیجا تاکہ انہیں یہیں حلب میں قیام پر آمادہ کیا جائے چنانچہ نور الدین زنگی کی درخواست پر ناظرہ وہیں رہنے پر آمادہ

۲ لہ تاہ التراجم، ص ۸۲، مفتاح السعاده، ج ۲، ص ۱۳۸

۳ لہ دائرہ معارف اسلامیہ، اردو ج ۱۷، ص ۱۶۔

۴ لہ طاش کو پسر و زادہ، مفتاح السعاده، ج ۲، ص ۱۳۷ نیز دیکھیے الجواہر المفضیۃ، ج ۲، ص ۲۴۵۔

۵ لہ القرشی، الجواہر المفضیۃ، ج ۲، ص ۲۴۵۔

ہو گئیں اور یوں علم و فقاہت کے یہ دونوں ستارے وفات تک آسمانِ حلب پر چمکتے رہے۔
 الکاسانی ایک نہایت ثقہ اور صحیح الاعتقاد عالم تھے معتزلہ اور اہل بدعت کا اکثر ذکر کرتے
 رہتے تھے اس سلسلے میں ایک مایہ ناز کتاب "السلطان المبین فی اصول الدین" بھی تصنیف کی
 جو اب نایاب ہے۔ ایک بار آپ دمشق پہنچے تو وہاں کے فقہاء آپ سے مناظرہ کرنے کے لیے آئے
 آپ نے فرمایا کہ میں اس مسئلہ میں گفتگو نہیں کروں گا جس کی طرف امام ابوحنیفہ کے اصحاب میں
 سے کوئی ایک بھی گیا ہوگا جو ان فقہاء نے بہت سے مسائل بیان کیے مگر آپ نے ہر مسئلہ میں دلائل
 سے ثابت کر دیا کہ اس طرف امام اعظم کے فلاں فلاں اصحاب کیے ہیں چنانچہ اس پر مناظرہ ختم
 ہو گیا۔

علامہ کاسانی کا انتقال حلب میں بتاریخ ۱۰ رجب ۵۸۷ھ اگست ۱۱۹۱م اتوار کے
 روز ہوا۔ ضیاء الدین محمد بن حبش الحنفی کہتے ہیں کہ میں موت کے وقت الکاسانی کے پاس موجود تھا
 اس وقت وہ سورہ ابراہیم پڑھ رہے تھے جب آیت کریمہ الذین آمنوا بالقرآن اللّٰہ تعالیٰ
 فی الحیوۃ الدنیاء و فی الآخِرۃ۔ پڑھتے تو ان کی روح قفسِ عنبری
 سے پرواز کر گئی "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ" اور حلب کے قبرستان ظاہریہ میں مقام ابراہیم
 خلیل اللہ میں اپنی بیوی فاطمہ کے پاس مدفون ہوئے لہٰذا آپ کو اپنی بیوی سے بے پناہ محبت تھی جب
 ان کا انتقال ہوا تو آپ کا دستور تھا کہ ہر جمعرات کو ان کی قبر کی زیارت کرتے اب حلب میں ان دونوں
 کی قبریں زیارت گاہ اور مستجاب الدعوات ہیں اور لوگوں میں خاوند بیوی کی قبر کے نام سے مشہور
 ہیں آپ کی تاریخ وفات "آفتاب زمانہ" ہے ۵۸۷ھ رحمة اللہ رحمة واسعة۔

شخصیت و کردار (ایک حیاتیاتی اور نفسیاتی جائزہ):
 الکاسانی کا مختصر سوانحی خاک بیان

۱۔ القرشی: الجواہر المفیضة، ص ۲ ص ۲۲۵۔

۲۔ اس آٹھویں تاج التراجم، ص ۸۵۔

۳۔ فقیر محمد جہلمی، حدائق الجنان، ص ۲۵۔

کرنے کے بعد اب ہم ان کی شخصیت و کردار کا حیاتیاتی اور نفسیاتی پہلوؤں سے ایک کلی اور عمومی جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔ کیوں کہ کاسانی کی علمی اور عملی خدمات کی وقعت اور افادیت جاننے کے لیے پہلے خود اس کی شخصیت کی نفسیاتی اور عمرانیاتی تشریح ضروری ہے اس لیے کہ کسی ذات کا وجود دنیا میں از خود نہیں ہو جاتا بلکہ ہر فرد بشر کی شخصیت اس کی حیاتی تعمیرات، تمدنی مہیجات اور تمدنی پیداوار کی اساس پر استوار ہوتی ہے خواہ وہ اپنی فطرت خام میں کتنا ہی جت و صلاحیت کی صلاحیت سے بہرہ ور کیوں نہ ہو؟

کاسانی کی شخصیت کی تعمیر میں حکیم مطلق کی مشیت نے معجزانہ فیاضی سے کام لیا ہے اس کی ذات میں ایک طرف ترکستان، بغداد اور شام کے کلچر کی لہریں ہم آغوش ہیں تو دوسری طرف علوم عقلیہ و نقلیہ اور بیانیہ کا حسین امتزاج ہے اور تیسری طرف زہد و ورع، عدالت و اخلاص اور جذب اندر دل سے بھی پوری طرح سرشار ہے۔ ذیل میں ہم کاسانی کی شخصیت کے مادی ترکیبی عناصر و بیانیہ روحانی خصائص اور تربیتی و اکتسابی اوصاف بالاختصار بیان کریں گے۔

کاسانی کی شخصیت کی مادی تعمیر و ترکیب
شخصیت کاسانی کے مادی ترکیبی عناصر: میں حسب ذیل عناصر کی کارفرمائی

۱۔ اقلیمی عناصر: ہوئی۔ کاسان دریائے سیحون کے جانب شمال، شاش سے پرے، اقلیم فرغانہ کا ایک بہت بڑا شہر تھا جو بہت سی بستیوں پر مشتمل، نہایت حسین، آبادی سے معمور اور پر رونق قصبہ تھا لیکن بعد میں ترکستانیوں کے متواتر حملوں کے باعث ویران سا ہو گیا تقویم البلدان میں آیا ہے:

قال ابن حوقل کاسان اسم لمدینة و اسم الناحية ایضا ولها قری
کثیرة۔ وقال احمد الکاتب وکاسان هی قصبہ فرغانة و هی
مدینة جلیلة القدر۔ وقال فی اللباب هی بلدة وراء الشاش

و یحتل صدق الکلامین وهو ان یکون وراء الشناش وهی من فرغانة
 لان اقلیم فرغانة وراء اقلیم الشناش. وقال فی المشترك وكاسان مدينة
 وراء نهس سیحون فی تخوم بلاد ترکستان خربت باستیلاء الترك و
 اختلاف الایدی علیها وكانت من محاسن الدنیا اهلا ورقعة له
 ترجمہ: یعنی ابن حوقل کے بقول کاسان ایک شہر کا نام ہے اور اس پوری سمت کا جو بہت سی بستیاں
 پر مشتمل ہے احمد الکاتب کے مطابق کاسان، فرغانہ کا قصبہ اور جلیل القدر شہر ہے اور
 اللباب میں ہے کہ وہ الشناش سے پرے واقع ہے اور یہ دونوں باتیں درست ہیں
 کہ کاسان شناس سے پرے اور اقلیم فرغانہ کا قصبہ ہے کیونکہ فرغانہ اقلیم شناس کے پیچھے
 واقع ہے اور المشترك میں ہے کہ کاسان نہر سیحون کے خلف میں ہے بلاد ترکستان کا شہر
 ہے جو اب ترکوں کے استیلاء اور بار بار کے حملوں سے ویران ہو گیا ہے لیکن پہلے آبادی اور
 باشندوں کے حسن ذوق کے باعث دنیا کے حسین ترین شہروں میں سے تھا۔

حکمائے ارضیات نے معمورہ عالم کو شمال سے جنوب تک سات حصوں میں تقسیم کیا ہے ہر
 حصہ کو اقلیم کہا جاتا ہے اور ہر اقلیم بہت سے حصوں پر مشتمل ہے۔ مذکورہ تصریحات کی روشنی میں
 الکاسانی کا شہر کاسان تیسری اقلیم کے آٹھویں حصے میں واقع ہے۔ اور ابن خلدون کے بقول تیسری
 اقلیم موسم اور آب و ہوا کے اعتبار سے معتدل اقلیم ہے اس کے ساتھ چوتھی اور پانچویں اقلیمیں بھی
 بحیثیت مجموعی معتدل متصور ہوتی ہیں کیونکہ یہ زمین کا درمیانی حصہ ہے کہ جنوب میں انتہائی گرمی
 اور شمال میں انتہائی سردی پڑتی ہے اور درمیانی حصہ میں دونوں طرف سے بتدریج گرمی اور سردی
 گھٹ کر اعتدال پر آجاتی ہے۔ یہی معتدل اقلیم علوم و صنائع تعمیر و آبادی شاندار عمارتوں، حسین
 و دیدہ زیب لباسوں، اناج و میوہ جات اور مویشی و حیوانات وغیرہ کا مخزن ہیں۔ کیونکہ ان میں تمام
 معتدل حالات کارفرما ہیں۔ یہاں کے باشندے جسم رنگ، اخلاق و عادات، صورت و سیرت، دین
 و مذہب اور تمام عمرانی و طبعی حالات مثلاً ذراٹھ روز گزار، تعمیرات، علوم و صنائع اور ملک و ریاست

میں حد اعتدال پر قائم ہیں لہٰذا بالخصوص تیسری اقلیم کے باشندے فرحت و سرور اور ذہانت و فطانت سے بہت زیادہ نالا مال ہوتے ہیں کیونکہ ماحول، موسم اور آب و ہوا کا اثر نہ صرف جسم بلکہ انسان کے تمام ذہنی اور قلبی احساسات پر بھی مرتب ہوا کرتا ہے۔ اور انسان اگر اپنی فطرت سلیمہ اور طبعی اعتدال پر قائم ہو تو تمام موسمی اور ماحولیاتی اثرات قبول کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔

بناء بریں ہمارے مدد و روح الکاسانی کی شخصیت کی تعمیر و ترکیب کا یہ بنیادی اقلیمی عنصران کی طبعی اور جسمانی ساخت سے لے کر ذہنی و روحانی استعدادات اور اخلاقی و کرداری میلانات اور عادات و اطوار تک میں جو سہ اعتدال کی کار فرمائی کی یقینی ضمانت اور شہادت جمیا کرتا ہے اور ہم بلا خوف و تردد یہ کہہ سکتے ہیں کہ الکاسانی اس مرزبوم کے طبعی اور حیاتی و درشے کا ایک جائز حقدار وارث ہے اور اپنے طبعی ماحول حیاتی اٹھان اور فطری نشوونما ہی میں زبردست ذہنی و فکری استعداد انتہائی فنی قابلیت و جمالیاتی ذوق اور غیر معمولی فطانت و فراست سے بہرہ ور ہے۔

۲۔ تمدنی مہجرات؛ ہر فرد پیدائش سے موت تک کسی نہ کسی ابتدائی فرقہ یا ملت کا ممبر ہوتا ہے اور اس کی ذہنی زندگی کی تمام عادات و رسوم اسی ملت سے ماخوذ ہوتی ہیں اور اگر اس وابستگی میں تنوع پایا جائے تو فرد کے معاشرتی علائق کی وسعت کے مطابق اس کی شخصیت کی تعمیر میں مختلف اور متنوع عناصر کی آمیزش ہوتی ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے جب ہم الکاسانی کے سوشل رول اور ملی وابستگیوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پیدائشی طور پر عجمی، ترکستانی قومیت، اموی اور عباسی ثقافتی عناصر کے امتزاج پر مشتمل جلی مرزبوم کی وطنیت اور اسلامی ملت سے دینی و روحانی وابستگی کے متنوع تہذیبی عناصر سے کاسانی کی شخصیت تشکیل پاتی ہے اور ان سبھی عناصر کی متنوع خصوصیات کا امتزاج رکھتی ہے اس اعتبار سے کاسانی کی سیرت میں لوح، ملائمت اور نفاست کے ساتھ ساتھ شائستگی، وقار و کمند، خودداری کے علاوہ حریت و استقلال اور مذہبی و ملی غیرت و حمیت ایسے متنوع

اصناف یکجا ہو گئے ہیں اور اس کی شخصیت میں ایک قسم کا امتزاجی تفرق و امتیاز پیدا ہو گیا ہے۔
 ثقافتی و تربیتی مؤثرات سے مراد وہ تعلیمی اور تہذیبی محرکات ہیں۔

۳۔ تہذیبی مؤثرات: جنہوں کا سانی کی شخصیت کے وہی عواطف و استعدادات اور ذہنی دروجی قومی عوامل کی تہذیب و تشکیل کی، اس کی بالقوہ فطرت کو بالفعل فطرت میں ڈھالا اور اسے نچنگی، بلوغت اور شادت عطا کی۔

اس سلسلہ میں یہ ایک مسلما اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ زمانہ اپنی علمی اور تمدنی رفتار اور ضرورت کے مطابق افراد پیدا کرتا ہے۔ ہر مفکر و مصنف اور موجد اپنے زمانے کے حالات کا ایک محکم آئینہ ہوتا ہے جس طرح تکوینی ایجادات ہر زمانے کی ذہنیت اور ضرورت کے مطابق ہوتی ہیں اور فطرۃ موجودوں کی طبیعتیں ان ہی ایجادات کی طرف چلتی ہیں جن کی زمانہ کو ضرورت ہوتی ہے ایسے ہی علماء مفکرین اور مصنفین بھی ہر دور کی علمی ذہنیت اور ضرورت کے مطابق ابھرتے ہیں جب کسی قوم میں فن شعر و ادب کا عروج ہو تو شعراء اور ادباء زیادہ پیدا ہوتے ہیں، جب فلسفہ و منطق اور کلام و عقلیات کا عروج ہو تو اسی طرح کے افراد تربیت پاتے ہیں اور جب فقہ و شریعات کا دور دورہ ہو تو فقہاء اور ماہرین شریعت ہی ابھرتے ہیں پھر ہر دور کے علماء اور مصنفین کی علمی اور تصنیفی و تدریسی کاوشوں کا رنگ بھی اس دور کی ذہنیت و ضرورت اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہر قوم و ملت کے عہد زوال و انحطاط میں جو علمی اور عملی شخصیات جنم لیتی ہیں وہ بنیادی طور پر کسی ایک علم و فن کی ماہر اور کسی خاص شعبے سے وابستہ نہیں ہوتیں بلکہ قوم کی مجموعی علمی و عملی ضروریات کی تکمیل اور کل قومی ورثے کی حفاظت و تقویت کے لیے ایسی جامع اور ہمہ گیر شخصیات ابھرتی ہیں جو تمام علوم و فن میں عمومی دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے علم و مہارت میں یکتا و منفرد اور اعلیٰ امتیازی مقام کی حامل بھی ہوتی ہیں جیسا کہ حدیث پاک:

ان الله يبعث لهداه الاممۃ علیٰ سراسر اس کل مائۃ سنۃ من یجدہا لہا۔

دینہا (او کما قال علیہ السلام)

یعنی اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر صدی کے آغاز پر تجدید دین کے لئے ایک ہمہ گیر شخصیت

کو سپید کیا جائے گا کی معنوی حکمتوں اور عمرانی و اجتماعی پس منظر پر غور کرنے سے پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ چونکہ ہجری صدی گزر جانے پر امت کو علمی اور عملی انحطاط کا شکار ہو جانے کے باعث جامع اور ہمہ گیر تجدیدی شخصیات کی ضرورت پڑتی رہے گی اس لیے ہر نئی صدی کے آغاز پر ایک مجدد پیدا ہوا کرے گا۔ چنانچہ یہ طے ہو گیا کہ عہد انحطاط میں امت کو اختصاص کی بجائے جامع اور ہمہ گیر شخصیات کی ضرورت پڑا کرتی ہے اس لیے عہد انحطاط میں جو علمی اور عملی شخصیات ابھرتی ہیں وہ مختلف علوم و فنون کی جامع، اور متنوع ذہنی دروہانی استعدادات کا امتزاج ہو کرتی ہیں۔

ادھر شروع میں ہم با تفصیل بیان کر آئے ہیں کہ کاسانی کا عہد امت مسلمہ کے لیے سیاسی تکلیت و ادبار، تمدنی انحطاط و زوال سیرت، اور علمی و فکری انتشار اور فقہی جمود و تصلب کا عہد تھا۔ لہذا اس دور میں ملت کو ایسے افراد کی ضرورت تھی جو ایک طرف فکری رسوخ، فقہی بصیرت اور علمی کمال میں ممتاز ہوں تو دوسری طرف گہرے تمدنی اور سماجی شعور، پختہ سیاسی فہم و بصیرت اور لاسخ دینی و اعتقادی اذعان سے بہرہ ور ہوں اور تیسری جانب ان کی عدالت و دیانت، زہد و ورع، اخلاص و ولہیت، اور خود داری و استقلال تاریخی مسلمات سے ہوں اور ان کی سیرت و کردار اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آئینہ دار ہو۔ تاکہ وہ اپنی فقہی و اجتہادی قوت سے ملت کا قانونی نظام استوار کر سکیں، اپنے علمی اور تربیتی کمال سے نظام تعلیم و تربیت کی آبیاری کر کے ایک صلاح اور باشعور نسل کی تعمیر کر سکیں، اپنے سچے سماجی اور سیاسی شعور کی بدولت قوم کو سیاسی اور عمرانی مشکلات کے گرداب سے نکلانے میں بھرپور کردار ادا کر سکیں اور اپنی عدالت و اخلاص اور سوز و مستی کے بلادۂ ناب سے امت کی روحانی اور ذوقی تسکین کا اہتمام بھی کر سکیں۔ چنانچہ اس عہد میں ابھرنے والی تمام بانیہ ناز شخصیات ان جملہ اوصاف علمیہ و عملیہ سے پوری طرح متصف تھیں۔ الغزالیؒ ہو کہ ابن الجوزیؒ، ابن رشدؒ ہو کہ ابن العربیؒ، الکاسانیؒ ہو کہ محی الدینؒ الجیلانیؒ، شخصیت علم و عمل میں جامعیت و آفاقیت اور حسن امتزاج کے لحاظ سے منفرد اور اوج کمال پر فائز ہے۔ ہمارے

مجدوح الکاسانیؒ کی ذات میں مذکورہ علمی، فکری، روحانی اور کرداری اوصاف نہایت اعتدال

استزاج اور حسن ترتیب کے ساتھ جمع ہو گئے تھے اور یہ جامعیت و درحقیقت اس عہد کی تمدنی ضروریات اور تمدنی تقاضوں کی تکمیل کی خاطر قدرت کا ایک حسین اہتمام تھا۔

ثانیاً طبعی ذہنی و کرداری خصائص کے لیے منتخب کرتی ہے تو اس کی تعمیر و

تشکیل میں اس امر کا پورا پورا اہتمام کرتی ہے کہ اس جلیل القدر کام کے لیے ضروری تمام ذہنی و روحانی استعدادات اور طبعی عواطف و میلانات اس شخصیت میں نہایت متوازن انداز سے ودیعت کر دیئے جائیں اور اسے جملہ اعلیٰ کرداری خصوصیات سے نوازا جائے تاکہ اپنے مفید و فریضہ حیات کی انجام دہی میں اسے کسی موقع پر کسی قسم کی دشواری لاحق نہ ہو۔ اس اعتبار سے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسانی کواست مسلمہ کے ہر جہتی عہد انخطاط میں علمی اور عملی دونوں سطحوں پر شریعت اسلامیہ کے تحفظ و اشاعت، تہذیب اسلامی کے استقرار اور نظام تعلیم و تربیت کی آبیاری کے لیے پیدا کیا گیا تو ساتھ ہی مذکورہ مقاصد کی تکمیل کے لیے لازمی خلقی و خلقی اوصاف و استعدادات سے بہرہ ور بھی پاتے ہیں۔ ذیل میں کاسانی کے چند بنیادی و مہی ذہنی و کرداری خصائص کی طرف اجمالی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اسلام میں فہم و ذکاؤ اور فطانت و فراست وہ بنیادی انسانی

۱- فطانت و فراست؛ وصف اور ذہنی صلاحیت ہے جو طلب علم سے لے کر فروغ

و تعلیم علم تک اور تفقہ و افتاء اور تحقیق و اجتہاد سے لے کر نفاذ احکام اور فصل خصوصیات تک بلکہ خود ایمان و اذعان سے لے کر انفرادی اور اجتماعی سطح پر عمل و کردار اور تعمیر سیرت و تشکیل شخصیت تک کے ہر مرحلہ میں ایک بنیادی رکن اور اولین شرط کی حیثیت سے ہر فرد میں حسب ضرورت پائی جانی ضروری ہے کیونکہ یہ عقل و فہم کا امتیازی وصف ہی ہے جو انسان کو دیگر تمام انواع مخلوق سے شرف و اعزاز بخشتا ہے اور یہی وہ وصف ہے جو اسکی تکلیف یعنی احکام شریعیہ کے فہم و امتثال اور بیان و نفاذ کا مخاطب ہونے کی بنیاد بنتا ہے اس کے بغیر انسان مرفوع القلم قرار پا کر دائرہ تکلیف سے خارج ہوتا ہے۔ لہذا ایک عالم کے لیے فطانت و فراست کا وجود از بس ضروری ہے بالخصوص

جبکہ اس کا دائرہ عمل فقہی استنباط و اجتہاد (خواہ کسی بھی درجے میں) اور افتاء و نفاذ ہو تو فہم و ذکاؤ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ علمائے اصول کی تصریح ہے کہ:

الاجتہاد يحتاج الى قدر اكبر من الفهم والعقل، فلا بد ان يكون المجتهد قوی الذكاء، دقیق الفہم فقیہ النفس قد ثبتت له ملكة يقتدر بها على فهم نصوص الشارع ومقاصده لان بدونه لا يتأتى الاستنباط المقصود بالاجتہاد له فان قلت فيه الفطنة والذكاء لم يصح منه الاجتہاد لئلا یعنی اجتہاد اعلیٰ درجے کے فہم و عقل کا محتاج ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مجتہد اور مفتی بھی مجتہد ہوتا ہے (قوی ذکاؤ، دقیق فہم اور فقہی ملکہ کا حامل ہونا کہ اسے نصوص شریعت اور مقاصد و اسرار شریعت سے پوری طرح شناسائی حاصل ہو سکے کیونکہ اس قدر گہرے فہم و فراست اور فقہی ملکہ کے بغیر استنباط احکام ممکن نہیں۔ لہذا جس شخص میں فطانت اور ذکاوت کم ہو اس کے لیے استنباط و اجتہاد (اور افتاء) اجتہاد پر مبنی ہوتا ہے، بہر گزروا نہیں۔ اور مفتی کے لیے چونکہ اہلیت اجتہاد کا ہونا ناگزیر ہے کیونکہ اس کا کام نئے پیش آمدہ مسائل کا شرعی حل پیش کرنا ہے اور اجتہادی صلاحیت سے بے بہرہ شخص اس کام کے لیے نااہل قرار پاتا ہے۔ لہذا مفتی کے لیے فہم و فراست اور ذکاؤ و فطانت سے متصف ہونا ناگزیر ٹھہرتا ہے۔

ادھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انکاسانی اپنے عہد کے اجتہاد و استنباط اور افتاء کے منصب پر نہایت امتیاز و لفر داور اس شان افتخار سے فائز ہے کہ اس دور میں کوئی فتویٰ اس وقت تک معتبر نہیں قرار پاتا جب تک اس پر انکاسانی، اس کی فقیہ بیوی اور اسٹاذ و خسر المسلم فتویٰ کے دستخط ثبت نہ ہو جائیں سہ تو ہمیں انکاسانی کی نادر فطانت و فراست، فقہی بصیرت اور استنباطی ملکہ کا یقین ہو جاتا ہے اور اس کی تالیف بدائع الصنائع کے مطالعہ سے یہ یقین مزید پختہ اور

لہ ذکر یا انصاری: غایۃ الوصول، ص ۱۱۴، محلّی، شرح جمع الجوامع، ج ۲ ص ۳۸۲۔

۲۱۱۱ اور دی: ادب القاضی، ج ۱ ص ۴۹۲۔

سے قاری محمد طیب: شرعی پردہ، ص ۱۰۲۔

راسخ ہو جاتا ہے کہ انسانی درجہ اول کا ذکی (Genius) ہے۔ اس کی باطنی دنیا فطرۃ غیر معمولی فطانت و ذہانت اور روحانی قوت و استعداد سے مالا مال ہے۔

عشق وہ جذبہ رفیع الہی ہے جو وجود حیات کی آرزو سے لے کر نمود ذات ۲۔ سوز عشق؛ اور ارتقائے زیست کے ہر احساس و تصور کی پسینائیوں میں سرایت

کیے ہوئے ہے جملہ انسانی اوصاف اور تمام جذبات و احساسات عشق ہی کے مختلف روپ ہیں اور اسی کی بدولت زندہ و پائندہ جس طرح بدن انسانی کی بقاء اور قوت کا دار و مدار حرارت عزیز پر ہے اسی طرح روح انسانی کی بقاء اور قوت کا کلی انحصار جذبہ عشق و محبت پر ہے

عشق کے مضرب سے نغمہ تار حیات
عشق سے نور حیات، عشق سے نار حیات

”بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود کائنات اور نظم کائنات اسی جذبے کی بنیاد پر قائم و استوار ہے کہ جملہ عناصر فطرت میں باہمی ربط و تعلق کی اساس عالمگیر کشش (Gravitation)

اور قوت جذبہ دار تباط ہے جو عشق ہی کا مظہر ہے۔ جو علی سینا کا قول ہے؛
کہ عشق ایسا جذبہ ہے جو کائنات کی ہر شے میں جاری و ساری ہے اور درجہ بدرجہ ہر شے حسن انزل کی جانب برابر گامزن ہے۔“

عشق آئین حیات عالم است - امتزاج سالمات عالم است۔ اقبال
شیشہ دھرمیں ماند مئے ناب سے عشق - روح خورشید ہے خونِ گلِ مستاب سے عشق اقبال
مولانا روم نے کس قدر وضاحت سے فرمایا ہے کہ:

حق جہاں را از محبت آفرید - ہر دو عالم از محبت شدید

اور

دور گردوں برا ز فیض عشق داں - گر بنودے عشق بفسردے جہاں
یہ جذبہ محبت و عشق چونکہ حیات انسانی کے جملہ مظاہر و آثار اور بالخصوص علم و شرع کی بنیاد ہے اس لیے یہ متصور نہیں کہ کوئی انسان شریعت اور اسلامی تمدن کے کسی شعبے میں

حقیقی علمی یا عملی مہارت حاصل کر لے اور جذبہ عشق سے بے بہرہ ہو۔ کیوں کہ بقول اقبال سے
 خصل و دل و نگاہ کامرشد اولیں ہے عشق - عشق نہ ہو تو شریخ و دیں، بنگرہ تصورات۔
 اس پہلو سے جب ہم اپنے ممدوح الکاسانی کی حیات و خدمات کا تجزیہ کرتے ہیں تو
 ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ عشق کا سوز و سرور موصوف کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے ہے
 اور اس کی تمام علمی، تدریسی، انتظامی اور فنی خدمات کی بنیاد ہی یہ جذبہ عشق قرار پاتا ہے کہ الکاسانی
 اسلام کے عہد انحطاط میں ابھرتا ہے اسے ملت کا ہمہ گیر زوال تڑپا دیتا ہے اور وہ اپنی زندگی
 ملت کی تہذیبی نشاۃ ثانیہ میں ہر محاذ پر علمی و عملی خدمات کے لیے وقف کر دیتا ہے اور پھر موت
 تک مقصد حیات کی اس لگن اور تڑپ کو برقرار رکھتا ہے۔ کاسانی کا عشق مقصد حیات کا عشق
 ہے، تعمیر ملت اور احیائے اسلام کا عشق ہے۔ اور خدا و حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق
 ہے۔ اس کا یہ سہ ابعادی عشق بدائع الصنائع کی سطر سطر سے جھلکتا ہے اور اگر اس کی کلامی کتاب
 السلطان المبین اور تفسیر قرآن بھی دستیاب ہو جائے تو اس سوز عشق کی کیفیات کا بھرپور اندازہ
 لگایا جاسکتا ہے۔ بدائع کے مطالعے سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ مصنف محبوب خدا صلی اللہ علیہ
 وسلم کی بے پناہ تعظیم و توقیر کو اساس ایمان سمجھتے ہوئے انتہائی باریک سے باریک فہمی چیزیں میں بھی
 اسے پوری طرح مد نظر رکھتے ہوئے استنباط حکم کرتا ہے۔ چنانچہ مصارف زکوٰۃ کے سلسلے میں فقہ
 شافعی کی رو سے اگر عامل زکوٰۃ ہاشمی ہو تو از روئے اجرت مال زکوٰۃ میں سے حصہ لے سکتا ہے حالانکہ
 امام شافعیؒ حنبلی اہل بیت میں معراج کمال پر فائز ہیں کہ ان کا شعر ہے۔

ان رفا صاحب ال محمد فلیشهد الثقلان انی رافض

الکاسانی امام شافعی کے اس موقف پر محاکمہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

ان المال الملبی صدقة... والصدقة مطهرة فصاحبها فتمکن
 الحیث فی المال فلا یباح للمہاشمی لشرفہ صیانہ لہ عن تناول
 الخبث تعظیم الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لہ

یعنی زکوٰۃ کا جمع کردہ مال صدقہ ہے اور صدقہ چونکہ صاحب صدقہ کا تزکیہ اور تطہیر کرتا ہے اور نتیجہ کدورت و میل، مال صدقہ میں آجاتی ہے اس لیے ہاشمی خواہ عامل زکوٰۃ ہی کیوں نہ ہو اسے مال زکوٰۃ سے محفوظ رکھنا ضروری ہے اور اس امر کی بنیاد تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ آگے چل کر وہ مال زکوٰۃ کی سادات کے لیے حرمت کی حکمت بیان کرتے ہوئے یہی حقیقت پھر دہراتے ہیں کہ:

والمحیی انہا من غسالة الناس فیتمکن فیہا الخبث فمان اللہ
تعالیٰ بنی ہاشم عن ذلک تشریفاً لہم واکراماً وتعظیماً لرسول اللہ
کاسانی کو ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر عشق ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم
کی سیرت پاک کے باریک سے باریک گوشے کی توجیہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و منصب
اور تعظیم و توقیر کے تقاضوں کو پوری طرح مد نظر رکھتا ہے۔ تعدد ازواج کی صورت میں مسلمانوں کو
عدل بین الازواج کی پابندی کی ہدایت کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازواج اور
عدل کی توجیہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ان منتهی العدد المشروع هو الاربع لان فی الزیادة علی الاربع
خوف الجور علیہم بالعجز عن القیام بحقوقہن بخلاف
نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لان خوف الجور منه غیر
سوہوم لكونہ مؤید علی القیام بحقوقہن بالتایید الالہی
فكان ذلک من الآیات الدالة علی نبوتہ لانه اشراف فقر علی الغنی والفقیر
علی السعة وتحصل الشداید والمشاہق علی الہوینا من العبادات والامور
الثقیلة وھذا الاشیاء اسباب قطع الشهوات والحاجة الی النساء ومع
ذلک کان یقوم بحقوقہن دل انہ صلی اللہ علیہ وسلم انما قدر علی ذلک باللہ تعالیٰ

ترجمہ: یعنی ہمارے لیے چار سے زیادہ حرام میں کہ ہم اس سے زیادہ ازواج کے حقوق کی ادائیگی اور قیام عدل سے عاجز ہیں۔
 بخلاف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ظلم اور نا انصافی کا تصور بھی ناممکن ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اسباب خواہشات سے انقطاع کے ازواج مطہرات کے حقوق کی ادائیگی میں پوری طرح کامیاب رہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمہ وقت تائید الہی و قرب خداوندی میسر رہنے اور آپ کی صدق نبوت کی زندہ شہادت و دلیل ہے۔

بے پناہ تعظیم و توقیر مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ الکاسانی اپنی کتاب میں قدم قدم پر مؤمنوں کو اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا درس دیتا ہے اور اس سلسلہ میں ہمیشہ قلبی اور وجدانی توجیہات پیش کرتا ہے۔

چنانچہ وضو میں گلی کرتے ہوئے تین مرتبہ سے زیادہ منہ اور ناک میں پانی ڈالنے کی حمانعت کی شرعی توجیہ میں کہتا ہے:

وَمَا الزَّيَادَةُ عَلَى الثَّلَاثِ فَمَنْ بَابِ الْإِعْتِدَاءِ عَلَى مَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَنْ زَادَ أَوْ نَقَصَ فَقَدْ تَعَدَى وَظَلَمَ لَهُ

یعنی تین مرتبہ سے زائد پانی منہ میں ڈالنا فرمان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر زیادتی اور سرکشی ہے تو جو شخص آپ کے فرمان سے زیادہ یا کم عمل کرے تو وہ اعتداء اور ظلم کا مرتکب ہے۔ اور ایسے میں اگر روزے کی حالت میں پانی چوتھی بار ڈالتے ہوئے حلق سے نیچے اتر جائے تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا لیکن اگر تین مرتبہ کے دوران ہی سہو پانی حلق سے اتر جائے تو یہ معاف ہے اور روزہ فاسد نہ ہو گا کیونکہ بقول کاسانی:

فَكَانَ الْخَطَاءُ فِيهَا مِنْ ضَرُورَاتِ إِقَامَةِ السَّنَةِ فَكَانَ عَفْوًا -

یعنی یہ غلطی چونکہ اقامت سنت کے دوران ہوئی ہے اس لیے معاف ہے۔

اس سے آپ کاسانی کے عشق رسول اور اتباع مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں

اس کے کمرے اذعان و اعتقاد کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ طواف میں فتح مکہ کے بعد رمل کرنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں

لما رمل النبي صلى الله عليه وسلم بعد زوال ذلك السبب صار
الرملة سنة مبتدأة فنتبع النبي صلى الله عليه وسلم في ذلك
وان كان لا نعقل معنا له

یعنی ظاہری سبب (اظہار قوت مؤمنین) کے زوال کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد طواف میں رمل فرمایا تو یہ از سر نو سنت قرار پایا اور ہم اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے پابند ہیں خواہ اس کی حکمت ہم نہ بھی جانتے ہوں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کاسانی کے نزدیک اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لائق اہمیت ہے۔ وہ اتباع رسول کو ایمان اور پابندی احکام شریعت کی اساس گردانتے ہیں اور ہر حکم شریعت کی حکمت اتباع مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو قرار دیتے ہیں۔ اور ایسا وہ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کا عہد ایک طرف زوال سیرت اور دوسری جانب فکری انتشار اور لادینی عقلی افکار کے فروغ کا عہد تھا۔ الگاسانی نے فتنہ عقلیت و وضعیت کے تدارک اور تعمیر سیرت کے لیے عشق و اتباع پر زور دیا یوں فلسفہ والحاد کی پیدا کی ہوئی ذہنی لامرکزیت کو قلبی کیفیات کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کی۔ اور فلسفہ عقلیت پسندی کے پیدا کردہ فتنوں کا حقیقی و فطری علاج بھی یہی ہے کیونکہ عقل محض کے مقابلے میں جب وجدانی حقائق اور روحانیت اسلامیہ کے اصول پیش کیے جاتے ہیں تو عقل کی حیثیت صرف چراغِ گمراہ کی سی رہ جاتی ہے اور انسان کو اپنے عروج کی منزل مقام عشق و وجدان اور اتباع محض پر نظر آنے لگتی ہے۔ اور اس کی سیرت صحیح خطوط پر تشکیل پاتی ہے۔

۵ دونوں جہاں کی رفعتیں ہیں تیرے اظہار میں
سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کر

۳۔ ذوق جمالیات و نفاست پسندی: حسن و نفاست زندگی اور عمل کی روح ہے اس لیے اسلام نے ہر عمل میں طہارت

و پاکیزگی، نفاست، ترتیب و سلیقہ اور نظم و ضبط پر از حد زور دیتے ہوئے نفاست پسند انسان کو اللہ کا محبوب قرار دیا ہے۔ اقبال کا فلسفہ خود ہی یہی ہے کہ انسان کی ذات ہر قسم کی کدورت و ردالت سے پاک اور ہر قسم کی نفاست و لطافت سے آراستہ ہو اسی چیز کو قرآن نے صبغہ اللہ یعنی الوہبی رنگ قرار دیا ہے۔

ایک فنکار اور فقیہ و عالم بھی ایک فنکار ہی ہے، کے لیے تو ذوق جمالیات اور نفاست و لطافت سے آراستہ ہونا اور بھی ضروری ہے۔ مصنف و قلمکار کے لیے فنی اور ادبی نفاست درکار ہے تو فکر و تخیل سے کام لینے والے کو فطری اور سماجی جمالیاتی ذوق کی ضرورت ہے۔ ہمارے مدد و حاکمان کی خلقت میں جمالیات کا خمیر ایک امتیازی عنصر ہے۔ اس کی طبیعت لطیف و لطافت پسند اور اس کا قلب حساس اور صاحب شعور ہے۔ اور اس کی یہ روح جمالیات ایک عظیم الشان نصب العین کی علمبردار ہے۔ کاسانی کی فکری اور ادبی جمالیات اور نفاست پسندی کا شاہکار اس کی کتاب بدائع الصنائع ہے جس کے نام ہی سے مصنف کی جمالیاتی روح اور ذوق کا بھرپور اظہار ہوتا ہے چنانچہ بدائع کی حسن ترتیب (الترتیب الضائع) جس کی وہ شروع سے آخر تک سختی سے پابندی کرتا ہے کاسانی کے فکری ذوق جمالیات کی آئینہ دار ہے تو ادب کی چاشنی اور زبان کی فصاحت و بلاغت، اشوع طرز استدلال اور محل اشعار کا استعمال اس کے ادبی ذوق جمالیات کا بھرپور عکاس۔ اس کے ساتھ ساتھ سوز و دروں کی گرمی سے جنم لینے والے کاسانی کے موقف اور احکام کی ذوقی توجیہات سے اسکی اعتقادی اور روحانی نفاست و جمالیات کی بھی ترجمانی ہوتی ہے۔

۴۔ رجائیت اور امید کیشی: انسانی زندگی دو متفرق و جدا گانہ نظریہ حیات کی اساس پر استوار ہے ایک متشائم نظریہ حیات

(Pessimist Theory of Life) اور دوسرا متفائل نظریہ حیات (Optimist Theory of Life) متشائم نظریہ حیات کے مطابق انسانی زندگی حزن و دکام،

رج و کرب، اور تکالیف و صعوبات سے عبارت ہے۔ یہ نظریہ غم کو لازماً حیات قرار دے کر انسان کو یاسیت شعارا اور قنوطیت پسند بنا دیتا ہے جبکہ متفادل نظریہ حیات انسان کو قنوطیت کے گرداب سے نکال کر رجائیت پسندی اور امید کیشی کے ساحل پر پہنچا دیتا ہے۔ یہ نظریہ انسان کو احساس نفس و تعین ذات کا درس دیتا ہے اسے جینے کے نئے انداز بخت اور زندگی کی وقعت و عظمت سے روشناس کراتا ہے۔

اسلام متفادل نظریہ حیات کا حامل ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ مؤمن کو کسی حالت میں مایوس نہیں ہونا چاہیے ”ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین“۔ ”رجائیت ایمان کا ثبوت اور زندگی کا سہارا ہے تو یاس زندگی کی مخالف اور کفر کا اظہار۔ اس لیے حکم ہے کہ:

ولا تیسوا من روح الله انہ لا یئس من روح الله الا القوم الکافرون

ع چراغِ زراہ حیات است جلوہ امید

کسانی چونکہ ایک راسخ الاعتقاد اور سوز عشق سے سرشار مؤمن ہے اس لیے اس کا مسلک امید کیشی اور رجائیت ہے۔ وہ یاس و قنوط اور احساس محرومی اس بھی نہیں بھٹکنے دیتا اور امید کا سہارا لے کر ملت زوال آمادہ کے احیاء اور بحالی تشخص کے کٹھن سفر پر جاوہ پیمانہ جاتا ہے۔ اس ہمہ گیر قومی انحطاط و اضمحلال کے عہد میں تدریس و افتاء اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ ہر ملیہ ملت کی نگہبانی الگاسانی کی رجائیت اور امید کیشی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

انسان کی اصل حقیقت اس کی ذات یا خودی ہے جس

۵۔ خود داری و خود اعتمادی؛ غنصری تو انسانی ذات کا تابع اور خدمت گزار ہے

جس نے ذات کے اظہار، نشوونما اور تکمیل اغراض کے لیے اپنی تمام جبلتوں سمیت خودی سے وجود پایا ہے۔ بقول اقبال ؎

قالب از ماست شدنے ما ازد ساغرا ز مئے مست شدنے مئے ازد۔
 پیکر ہستی ز آنا ر خودیست ہر چہ می بینی ز اسرار خودیست
 بناء بریں زندگی کا حقیقی مقصود انسانی ذات یا خودی کی نشوونما اور تکمیل ہے۔ کیوں کہ
 انسانی ذات ہی سے انسان کی تکمیل ہوتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں: زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا
 انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب پیدا نہ ہو۔ اور
 کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود انسانوں کے ضمیر میں متشکل
 نہ ہو فطرت کا یہ اہل قانون جس کو قرآن نے ”ان الله لا یغیر ما بقوم حتی
 یغیروا اما با نفسہم“ کے سادہ اور پلین الفاظ میں بیان کیا ہے زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں
 پہلوؤں پر حاوی ہے“ لہ

یوں انسان کے اندر زندگی کا مرکز خودی یا آنا ہے اس کی توسیع، تربیت اور انتظام ہی جملہ
 علوم و فنون اور تمام نظمیہ و احوال کا مقصود و حاصل ہے ادبیات، مذہب اور اخلاقیات کے اثرات
 کا صحیح اندازہ اسی معیار سے قائم کیا جاتا ہے۔

بقول اقبال: ”تمام انسانی جدوجہد کا انجام فقط حیات ہے اور تمام انسانی علوم و فنون اسی
 مقصد کے حصول کے تابع ہیں اس لیے ہر علم و فن کی منفعت کا اندازہ اس کی حیات آفرین قوت

(تفسیر صفحہ ۱۲۳) کہ اعتبار سے مادی ہے۔ مادہ ہی جو حقیقی ہے اس کے مادہ اور کچھ نہیں اس لیے ذات یا نفس انسانی کوئی مستقل
 اور جداگانہ وجود نہیں رکھتا بلکہ طبعی جسم ہی کے عمل کا نتیجہ ہے جو مادہ کے ذرات کی کیمیائی ترکیب سے پیدا ہوتا ہے اور جسم انسانی
 کے طبعی افعال کے خاتمہ کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے لیکن بیسیویں صدی کے سائنسی انکشافات اور طبعی تحقیقات نے یہ ثابت
 کر دیا ہے کہ زندگی مادہ سے پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی نفس و ذات انسانی بلکہ مادہ خود غیر حقیقی اور ناپائیدار شے ہے جو بقول
 مسٹر پلانگ شعور کا نتیجہ ہے۔ سر آئیور لاج کے بقول: کائنات پر شعور یا خودی کی حکومت ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ہستی کو معنی
 نیز بناتی ہے اور ہماری زندگی میں رونق پیدا کرتی ہے۔ یوں اب سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ انسانی ذات یا خودی ہی اصل
 حقیقت ہے اور مادہ کی ہر حالت کا وجود اس کا مرہون منت ہے۔

ہی سے لگایا جاسکتا ہے مثلاً اعلیٰ ترین فن وہ ہے جو کہ ہماری جمعی تورت ارادی کو بیدار کرے اور ہمیں مصاف زندگی میں مردانگی سے مقابلہ کرنے کی طاقت بخشنے لے

غرضیکہ اقوام و افراد کا تسلسل جہاد، دوام عمل، پختگی، یقین اور احساس خودی پر مبنی ہے اور خودی کی حفاظت، اس کی تربیت اور استحکام کا راز خود اعتمادی، خود داری اور استغنا سے وابستہ ہے۔ اس لیے ہر عظیم علمی و عملی شخصیت میں خود داری اور خود اعتمادی کا وجود ناگزیر ہے۔ اور ان اوصاف کا فقدان قومی انحطاط کا لازمی نتیجہ ہے جب کسی قوم میں تنزل رونما ہوتا ہے تو اس کے افراد میں جذبہ غیرت و اعتماد نفس اس قدر مفقود ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ذلت اور فردمانگی کے احساس سے بھی عاری ہو جاتے ہیں لیکن قدرت کا یہ حسن اہتمام ہے کہ ہمارا ممدوح الکسانی باوجود قومی انحطاط کے عہد میں پیدا ہونے کے جذبہ احساس نفس اور خود داری و خود اعتمادی کے مصاف سے پوری طرح متصف ہے۔ موصوف کے اسی وصف خود داری کا ایک نمایاں ترین مظہر جذبہ غیرت ملی اور حمیت مذہبی ہے چنانچہ فقہی مذاہب میں وہ جس مکتب فکر سے وابستہ ہیں اس کی حفاظت و تقویت اور فروغ و اشاعت میں انتہائی غیرت و حمیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور بقول شیخ محمد عبدہ یہ غیرت مسلکی اور عصبیت مذہبی انسان کی مذہبی زندگی کی بقا کا لازمی عنصر ہے اس جذبہ کے بغیر انسان سیکور اور لادین تو قرار پاسکتا ہے کسی مذہب و ملت کا فرد نہیں بن سکتا۔ چنانچہ الکسانی ابتدا میں سلجوقی دربار سے وابستہ تھے ایک مرتبہ کسی فقیہ سے مسئلہ تصویب مجتہد میں مناظرہ ہو گیا۔ وہ فقیہ اس پر اصرار کرنے لگا کہ امام اعظم ابوحنیفہ سے یہ منقول ہے ہر مجتہد مصیب ہے۔ کاسانی اس کی فکری لغزش پر تنبیہ کرتے رہے اور بار بار صحیح ترین جوابوں سے بتاتے رہے کہ امام صاحب کا موقف یہ ہے کہ حق واحد ہے اور ایک مسئلہ کے دو متضاد احکام میں ایک ہی رائے صاحب ہوگی۔ وہ فقیہ اپنی رائے پر مہٹ دھرمی سے جبار ہا اور تلخ کلامی پر اتر آیا تو الکسانی نے غیرت مذہبی میں اس کی سرزنش کر دی اور دربار سے اپنا تعلق منقطع کر لیا اس واقعہ کے بعد سلجوقی حکمران نے اپنے وزیر کے مشورے سے انہیں حلب میں نورالدین زنگی

کے دربار میں سفیر بنا کر بھیج دیا جہاں ان کا بڑی تعظیم و تکریم سے خیر مقدم کیا گیا یہ تھی الکاسانی کے جذبہ خودداری اور غیرت مذہبی کی ایک ادنیٰ سی جھلک حقیقت یہ ہے کہ یہ جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور وہ کسی قیمت پر اپنے اعتماد نفس کو مجروح نہیں ہونے دیتے تھے جو ایک غیور مومن کی نمایاں نشان

۶۔ کمال طلبی و اصلاح پذیری: مغربی تہذیب اسلام کا مابہ الامتیاز مبداء طلب کمال ہے کہ مغرب تنازع البقاء کے حوالے سے زندگی کی تشکیل و تعمیر

پر یقین رکھتا ہے جب کہ اسلامی تہذیب کی اساس انسان کا فطری جذبہ طلب کمال ہے بقول امام رازی ہر قسم کا کمال علمی و عملی انسان کے لیے بالذات محبوب و مطلوب ہے یعنی ع ہے جسے کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں۔

اقبال نے اسرار خودی میں تفصیل سے بتایا ہے کہ انسانیت اور خودی کی تکمیل سپہم تخلیق مقصد ہی سے ہوتی ہے اور یہی نامحدودیت طلبی انسان کا طرہ امتیاز ہے کہ وہ نہ تو علم میں کسی ایسی حد پر ٹھہرنا گوارا کرتا ہے جس کے آگے کوئی جہل باقی رہ جائے اور نہ قوت و قدرت کے کسی ایسے درجے پر قانع ہوتا ہے جس کے بعد کوئی چیز اس کی طاقت سے باہر رہ جائے۔ بقول اقبال۔ ع

ع ظلم نہایت آں کہ نہایتے ندارد۔

یہی جستجوئے کمال اور نامحدودیت طلبی اسلام میں طالب علم اور عالم کا سرمایہ افتخار ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اصلاح پذیری کا عنصر بھی ہونا چاہیے ورنہ اصلاح پذیری کے بغیر کمال طلبی اور جستجوئے خیر کا تحقق ممکن نہیں کہ یہ دونوں وصف باہم لازم و ملزوم ہیں۔ زیر نظر شخصیت الکاسانی کی ذات میں یہ کمال طلبی اور اصلاح پذیری کے دونوں عناصر پوری طرح گھل مل گئے ہیں چنانچہ ایک طرف اگر وہ ہر لمحہ علمی ترقی کے جو یا نظر آتے ہیں تو دوسری طرف قدم قدم پر اصلاح پذیری کی صلاحیت بھی بہرہ ور ہیں۔ الکاسانی باوصف تمام اقوال ائمہ کے حافظ ہونے کے جب کبھی فتویٰ میں خطا کرتے اور آپ کی فقیر بیوی وجہ خطا بتا دیتی تو آپ اسکے قول کی طرف رجوع کر لیتے تھے یہی کمال طلبی اور اصلاح پذیری کی خوبی ہے۔ تم و ترقی میں روز افزوں ترقی کا باعث تھی۔

تربیتی و اکتسابی اوصاف | ہر انسان میں فطری طور پر قدرت کے ودیعت کردہ اوصاف و استعدادات کے علاوہ تعلیم

و تربیت سے نشوونمائے ذات کے ذریعہ بھی مختلف ذہن اور کرداری اوصاف و میلانات ابھرتے ہیں کیونکہ تعلیم و تربیت درحقیقت انسان کی تمام مغزی طبعی صلاحیتوں کے فطری مسلسل اور ہم آہنگ ارتقاء کے ذریعہ تعمیر سیرت کے عمل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ ابن خلدون کہتے ہیں: "انسان کے اندر نفس ناطقہ میں ہر طرح کی صلاحیت ہوتی ہے نفس ناطقہ کی صلاحیت کو عدم سے وجود میں لانے کے لیے علوم و ادراکات کی ضرورت پڑتی ہے۔ جوں جوں انسان علوم حاصل کرتا ہے اسی نسبت سے اس کی قوت فعل سے بدلتی جاتی ہے اس سے ظاہر ہے کہ علم و نظر کی ہر نوع سے ایک نئی قسم کی عقل پیدا ہوتی ہے ۱۷

زیر نظر شخصیت الکاسافی کی ذات میں مذکورہ وہی خصائص و امتیازات کے علاوہ حسب ذیل تربیتی و اکتسابی اوصاف و استعدادات نمایاں ہیں۔

علم بمعنی مجموعہ معلومات محض سوز و ماغ اور حافظہ کا بوجھ ہے۔

۱۔ حکمت و بصیرت | صحیح معنوں میں علم اس وقت علم بنتا ہے جب سوز قلب میں ڈھل کر عقین کے درجے تک پہنچ جائے اور اندرونی و بیرونی حقیقت یکجان ہو جائے کہ بقول کسی *to the outer truth* Knowledge is response of inner truth ایسا علم حکمت و بصیرت کا درجہ حاصل کر کے انسان کا مطیع و منقاد اور اس کے مقصد حیات کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ بقول شیخ ابوالنجیب سہروردی: "جب علم قلب تک پہنچتا ہے تو دل کی آنکھیں کھل جاتی ہے وہ حق و باطل کو دیکھنے لگتا ہے اور ہدایت و گمراہی کا فرق معلوم کر لیتا ہے ۱۸

اس لیے عقل و قلب کی آمیزش سے تشکیل پانہوالی حکمت و فراست ہی علم کا سب سے

اوپچا درجہ اور فقیہ کا اصل مقام ہے۔ اسی سے فضیلت علمی کا معیار متعین ہوتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا۔

حکمت کی تعریف اور ماہیت کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔

بیضاوی نے اس کا وسیع ترین مفہوم یہ بیان کیا ہے:

استعمال النفس الانسانیة باقتباس العلوم النظریة واكتساب الملكة التامة

على الافعال الفاضلة على قدر طاقتها۔

یعنی نفس انسانی کا فطری علوم کو حاصل کرنا۔ اور اعمال فاضلہ کی حسن ادائیگی کا ملکہ تامہ بقدر طاقت حاصل کرنا۔

البرجانی نے کتاب التعریفات میں حکمت کا جو مفہوم پیش کیا ہے وہ بھی علم و عمل دونوں کو شامل ہے۔

ابن سینا کہتے ہیں: "علم اور عمل کی حدود کے اندر رہ کر روح کے ادراک کمال کا

نام حکمت ہے اس میں ایک طرف تو صفت عدل کا کمال ہے اور دوسری طرف نفس عاقلہ (Reasoning Soul) کی تکمیل شامل ہے یوں یہ نظریاتی اور عملی معقولات دونوں پر مشتمل ہے۔"

دوسرے مقام پر وہ رقمطراز ہیں: یہ مشاہدے کا فن ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے

اندراک (علم کے ذریعہ) ہر وجود رکھنے والی چیز کا اور اس چیز کا جس پر اسے ضرور عمل کرنا چاہیے تاکہ وہ بلند و کامل اور ایک معقول عالم بن جائے، تحقیق کر لیتا ہے۔ اس اعتبار سے ایک حقیقی عالم کے لیے حکمت و بصیرت مذہبی کا حصول ناگزیر اور وجہ فضیلت امتیاز قرار پاتا ہے

۱۔ بحوالہ دائرہ معارف اسلامیہ، عربی ج ۸، ص ۱۴

۲۔ البرہان، ص ۲۶۰

۳۔ الرسالہ فی اقسام العلوم العقلیہ، ص ۱۰۴

اور جب ہم اپنے مدد و الحکامسانی کے علم کا جائزہ اس کی تالیف بدائع الصنائع کے حوالے سے لیتے ہیں تو قدم قدم پر اس یقین افزا مشاہدے سے سرشار ہوتے ہیں کہ الحکامسانی فی الواقع مذہبی بصیرت و حکمت سے بہرہ ور عالم ہے جیسا کہ اوپر سوزمحقق اور کمال طلبی کے حوالے سے ہم اشارہ کر آئے ہیں اور مزید تفصیل آگے کا سانی کے پایہ علمی کے بیان اور بدائع کے تجزیاتی مطالعہ کے ضمن میں آئے گی۔

علمائے نفسیات کی مسلمہ رائے ہے کہ انسان کی زندگی اس کے

۲۔ فکری تنظیم و ترتیب افکار و خیالات کی پر تو ہے۔ کہ ہمارے بہر عمل کایج ہمارے خیال میں ہوتا ہے۔ افکار ہی زندگی کے انداز کو متعین کرتے ہیں تن اور من دونوں کی صحت و تندرستی کا مدار افکار پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی بنیاد فکر و نگہ اور تصور کی بلندی و گہرائی ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مؤمن پر اچھے اور برے ہر قسم کے خیالات اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے فکر کو صالح، مہذب اور منظم بنانے کی ضرورت ہے کہ منظم فکری ہی منظم عمل کی بنیاد بنتا ہے۔ اور فکری پراگندگی سے عمل میں انتشار و اضمحلال در آتا ہے۔ تنظیم و ترتیب متنوع عناصر کو اس انداز سے ہم آہنگ کرنے کا نام ہے کہ ان کے باہمی رد و ابط سے ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جائے جو پختہ اور طے شدہ ہو۔ یہ فکری تنظیم و ترتیب علمی بصیرت و حکمت مکملہ تفقہ و استنباط اور قوت استدلال کے حصول کے لیے ناگزیر ہے۔ ڈاکٹر ٹیکو کہتے ہیں۔
تعلیمی نظاموں میں ہماری قوت غور فکر کی ترتیب و تنظیم ضروری ہے تاکہ ہمارے دماغ راستی کی دنیا میں آزادی کی ہوا کھا سکیں۔

ہمارا مدد و الحکامسانی فطری اور تربیتی نشوونما میں فکری تنظیم و ترتیب کی معراج کمال پر فائز ہے اس کی تالیف بدائع الصنائع کا صفحہ صفحہ اور سطر سطر اس پر شاہد عدل ہے۔

لے ڈاٹ بیٹا، تعلیم کے مقاصد، مترجم سید عبد اللہ، ص ۱۶۰

کی فقی بصیرت و حکمت، اعلیٰ ملکہ علم و استنباط اور منفرد سائنٹیفک طرز استدلال اس کی اسی فکری تنظیم و ترتیب پر مبنی ہے اور اس تنظیم فکر و استدلال میں اس کے مایہ نادر استاذ محمد بن احمد بن ابی احمد السمرقندی کی حسن تعلیم و تربیت کا بے پناہ دخل ہے۔ جو خود بھی ایک منظم اور مرتب استقرائی فکر و علم کے حامل تھے۔

۳۔ ایتقان و اذعان: یقین اور ایمان لازم و ملزوم ہیں بلکہ ایمان درحقیقت نام ہی تصدیق قلبی، یقین و اعتقاد اور اذعان و گرویدن کا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے کہ ”یقین ایمان ہے“ اور بقول شاہ ولی اللہ تمام احوال و مقامات انسانی کی بنیاد یقین پر ہے یقین ہی سے توحید، اخلاص، توکل، شکر، انس، ہیبت، تفرید، صدیقیت اور محمد ثنیت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اہل ایمان کو اہل یقین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

هٰذٰلِكَ اٰیٰتُ اللّٰتِ اِسْمٌ وَّ هٰدٰی وَّ رَحْمٰةٌ لِّقَوْمٍ یُّدْعُوْنَ۔

پس یقین اسلامی زندگی کی جان ہے۔ جس طرح قالب روح کے بغیر اور اسکی بھی بغیر نور کے بے لطف ہیں اس طرح مرتبہ یقین کے بغیر اعمال بے کیف ہیں۔

بالخصوص عند انخطاط میں تو اعتقادی اور عملی یقین کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔ الکاسانی امت کے عند انخطاط میں پیدا ہوئے اور یقین کی دولت سے مالا مال قلب لے کر آئے۔ وہ ایک نہایت ثقہ اور صحیح العقیدہ عالم تھے اور معتزلہ و اہل البدعہ اور دیگر گمراہ فرقوں کا اکثر رد کرتے رہتے تھے۔ ان کا ایمان، ان کا علم اور ان کا عمل قوت ایتقان و اذعان سے لبریز تھا۔ ان کی کتاب ”السلطان المسین فی اصول الدین“ ان کے یقین اعتقادی کی پختہ شہادت ہے اور ان کے عقلمناظرے و مجادلے، خود داری و خود اعتمادی اور غیرت مذہبی و حمیت ملی دراصل ان کے علمی یقین کے نمایاں مظاہر ہیں۔

۴۔ تقویٰ و عدالت :- تقویٰ اسلامی نقطہ نظر سے عمل و کردار کی اساس بھی ہے، محرک و سرچشمہ بھی اور روح و جان بھی۔ قرآن کریم نے مؤمن کی پہچان ہی تقویٰ بتائی ہے علم و ہنر اور اختیار باعث تقویت حیات ہیں لیکن غیر تقویٰ کے باعث ہلاکت بن جاتے ہیں کیونکہ یہ آلات حیات ہیں اور آلات سے وہی شخص صحیح کام لے سکتا ہے جس نے ضبط و مہارت سے اپنے آپ کو اس قابل بنایا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مفتی کے قول کی قبولیت و عمل کے لیے تقویٰ و عدالت کی شرط لگائی گئی ہے بلکہ علامہ سبکی نے عدالت و تقویٰ کو اجتہاد کا رکن اور اس کی ماہیت میں داخل ٹھہرایا ہے لہ

فاسبق کا فتویٰ قابل قبول نہیں کیونکہ جو مفتی بعض مخطورات دنیویہ کے ارتکاب میں عار محسوس نہیں کرتا اس سے باقی محرمات کا ارتکاب بھی بغیر نہیں کہ تمام مخطورات و ممنوعات باعتبار میلان نفس کے مساوی ہیں۔

علامہ عبد العزیز البخاری کی تصریح ہے کہ:

لان کل المحظورات من حیث یبیل الطبع الیہا سواء لہ
پس ایک عالم اور بالخصوص مفتی کے لیے تقویٰ و عدالت سے متصف ہونا اولین شرط ہے اور بحمد اللہ ہمارا ممدوح الکاسانی زہد و ورع اور تقویٰ و اخلاص کی دولت سے مالا مال ہے۔

یہ دولت اسے فطرت اور اپنے زاہد و متقی استاذ کی تربیت کے فیضان میں میسر آئی ہے اور اس قدر بختگی اور گہرائی کے ساتھ کہ اس کے ہاں فتویٰ اور تقویٰ یکجا ہو گئے ہیں وہ حیلہ فقہی اور لفظ قانون کی پیروی کو جائز نہیں سمجھتا بلکہ قدم قدم پر یہ روح قانون اور مقاصد شریعت کی تکمیل کی تلقین کرتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ ادائیگی زکوٰۃ کے بارے میں فقہی مسئلہ یہ ہے کہ اگر حکومت کا باغی گروہ لوگوں سے حیرت زکوٰۃ وصول کر لے تو ان سے دوبارہ زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے

لئے السبکی اللہ ماج، شرح المنہاج، ج ۳، ص ۱۷۷

لئے البخاری: کشف الاسرار، ج ۳، ص ۱۸۶

گی لیکن فقیر کا سانی یہ مسئلہ نیاں کرنے کے بعد استدرا کا کتاب ہے :
 الا انھم یفتون فیما بینہم و بین ربہم ان یؤدوا الزکوٰۃ والعشور ثانیاً۔
 یعنی البتہ انہیں اپنے رب سے رشتہ و عبدیت کے استحکام کی خاطر یہ فتویٰ دیا جائے
 گا کہ وہ زکوٰۃ اور عشر دو بارہ ادا کر دیں۔

سبحان اللہ! روح الشریعت کی پیروی اور مقاصد دین کی تکمیل کے لیے تعمیر سیرت
 کا کس قدر اہتمام ہے کہ فتویٰ کو تقویٰ کے تابع کر دیا ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں کا سانی زاہد
 خشک نہیں بن جاتے بلکہ سماجی شعور سے پوری طرح آراستہ ہیں اور حقیقی اسلامی تصورات
 کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل و تنظیم کرنا چاہتے ہیں۔ صوم وصال سے تنہی
 کی حکمت بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

ان النہی عن صوم الدھر لما یضعفہ عن الفرائض والواجبات ویقعدہ

عن الکسب ویؤدی الی التبتل المنہی عنہ۔

یعنی صوم دھر اس لیے منع ہے کہ اس سے انسان دیگر فرائض و واجبات کی ادائیگی
 میں ضعف و کمزوری محسوس کرتا ہے اور معاشی جدوجہد میں پوری طرح حصہ نہیں لے
 سکتا۔

نیز اس سے ممنوع تبتل یعنی رہبانیت کا تصور ابھرتا ہے جو اسلام میں نہیں پایا جاتا
 الغرض کا سانی اپنے تمام استنباطات اور فتاویٰ میں قاعدہ احتیاط اور تقویٰ کو پوری
 طرح ملحوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ بھرپور سماجی شعور اور اجتماعی زندگی کے تقاضوں سے آگے
 کا بھی مظاہرہ کرتا ہے۔

زندگی میں کامیابی و کامرانی کا حصول تسلسل، استقامت
 ۵۔ ثبات و استقلال :- اور مستقل مزاجی پر منحصر ہے۔ کسی عمل کو نتیجہ خیز اور بار آور

بنانے کے لیے اسے انتہائی مستقل مزاجی اور بہت وقوت کے ساتھ مسلسل اور بار بار انجام دینا ضروری ہوتا ہے۔ لگاتار محنت اور استقلال کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں ثبات و استقلال کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن کریم میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے فاستقم كما امرت ایک صحابی کے نجات کا راز پوچھنے پر اس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قل امنت بالله ثم استقم یعنی ایمان کے بعد استقامت ہی ذریعہ نجات ہے۔

نیز فرمایا:

احب الاعمال الى الله ادومها وان قل۔

استقامت کی اسی اہمیت کے پیش نظر کہا گیا ہے کہ:

اطلبوا الاستقامة ولا تطلبوا الكرامة فان الاستقامة فوق الكرامة۔
یعنی کرامت کی استعدا کر و بلکہ استقامت طلب کرو کہ استقامت کا مرتبہ کرامت سے برتر ہے۔

بنیاد بریں اہل علم و تقویٰ کی حقیقی فضیلت کا معیار ثبات و استقلال میں ہے اور زیر نظر شخصیت الکا سانی دیگر اخلاق اسلامیہ کی طرح اس وصف سے بھی پوری طرح متصف ہے۔ بدائع الصنائع کی تالیف میں جو حسین اور پسندیدہ ترتیب اپنائی اسے آخر تک پوری طرح نباہ کر یہ بتا دیا کہ وہ جو کام بھی شروع کر دیتے ہیں اسے نہایت استقلال کے ساتھ اسی انداز سے تکمیل تک پہنچانے کے جوگر ہیں۔

جب آپ کی اہلیہ فوت ہوئی تو ہر محمرات کو ان کی قبر کی زیارت کا جو معمول بنایا آخر تک اس میں کمی اور انقطاع نہ آنے دیا۔

بقول صاحب جواہر المصنئۃ:

وكان الكاساني لم يقطع زیادة قبره ا لہ

اس سے پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ کاسانی اپنی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے عمل میں بھی کس قدر استقامت، استمرار اور استقلال پر قائم رہے۔ ان کے وصف استقلال کی شہادت وفات کے وقت ان کی کیفیت اور زبان پر جاری ہونے والی آیت کریمہ کے مفہوم سے بھی ملتی ہے۔ ابن عدیم کہتا ہے میں نے ضیاء الدین حنفی سے سنا ہے کہ جب کاسانی کی موت کا وقت قریب آیا تو میں ۱۰ ارب رجب ۸۷۷ھ کو ان کے پاس گیا۔ اس وقت وہ سورہ ابراہیم پڑھ رہے تھے جب آیت کریمہ ”یثبت اللہ الذین آمنوا بالقول الثابت“ پر پہنچے تو روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اور حلب کے قبرستان ظاہریہ میں مقام ابراہیم خلیل اللہ میں اپنی بیوی فاطمہ کے پاس مدفون ہوئے۔ اور پریم کاسانی کی علمی بصیرت و حکمت اور کاسانی کی فقہی بصیرت اور پایۂ اجتهاد: - فکری تنظیم و ترتیب کی طرف اشارہ کر آئے ہیں۔ ذیل میں بالاجمال کاسانی کی فقہی استعداد اور اجتهادی مقام کے تعین کی کوشش کریں گے۔

جملہ تکالیف شرعیہ سے منصوص نفس انسانی میں ایک ہیئت راسخہ اور ۱۔ ملکہ علم و تفقہ: - ملکہ ثابۃ کا حصول ہے جس سے طاعت و انقیاد کی خواستوار ہو جائے اور احکام شرعیہ کی پابندی فطرت بالفعل میں یوں ڈھل جائے کہ ایک کیف سامحوس ہونے لگے اور عبدیت اضطراری، حقیقتاً عبدیت اختیاری میں بدل جائے۔

ابن خلدون کہتے ہیں:

ان المطلوب فی التکالیف الشرعیہ کلہا حصول ملکہ راسخۃ فی النفس
 یحصل منها علم اضطراری للنفس، فالمتبر فی التوجید لیس هو الایمان
 فقط الذی ہو تصدیق حکمی وانما الکمال فیہ حصول صفت منہ تتکیف بہا النفس
 کما ان المطلوب من الاعمال والعبادات ایضاً حصول ملکہ الطاعت

والانقیاد لہ

یعنی تمام احکام شریعہ سے مطلوب نفس میں ایک ملکہ راسخہ کا حصول ہے جو علم اضطرابی کو ختم دے۔ پس توحید میں ایمان بمعنی تصدیق حکمی مطلوب نہیں بلکہ کمال ایمان عبارت ہے ایک صفت راسخہ کے تکلیف سے اور اسی طرح تمام اعمال و عبادات مقصود طاعت انقیاد کے ملکہ کا تحقق ہے۔

ایمان و اعمال کی طرح حصول علم میں بھی اصل اعتبار حذق و مہارت اور ملکہ علمی کا ہے کہ علم میں ماہر ہونا، اس میں جدت پیدا کرنا اور اس پر پوری طرح سے عبور حاصل کرنا اسی وقت ممکن ہے جب انسان کے اندر اس کے مبادیات، اصول و قواعد پورے پورے مسائل کا احاطہ اور اس کے جزئیات کو کلیات سے استنباط کرنے کا ملکہ پیدا ہو جائے جب تک یہ ملکہ پیدا نہ ہو کمال علمی کا حصول ممکن نہیں اور یہ ملکہ محض مسائل کے سمجھ لینے اور یاد کر لینے سے نہیں پیدا ہوتا کیونکہ مشاہدہ ہے کہ کسی علم کے مسائل کو سمجھنا اور یاد کر لینا مبتدی اور منتہی دونوں میں مشترک ہوتا ہے۔ ملکہ صرف عالم ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

ابن خلدون کے الفاظ میں۔

ان الحدق فی اسی علم من العلوم والاستیلاء علیہ انما ہو بحصول
ملکة فی الاحاطة بمبادئہ وقواعدہ والوقوف علی مسائلہ وما لم تحصل
ہذا الملکة لم یکن الحدق فی ذلک المتناول حاصلًا
علامہ تفتازانی نے تو علم کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ:

ان العلم عبارة عن ملکة یقتدر بہا علی ادراکات جزئیة

یعنی علم نام ہی اس ملکہ راسخہ کا ہے جس سے جزئیات کے اور اک پر قدرت

لہ مقدمہ ابن خلدون: ج ۱ ص ۱۱۷۲

لہ مقدمہ: ج ۱ ص ۱۱۹

لہ حاشیہ تفتازانی بر شرح العنصر، ج ۱ ص ۲۳

حاصل ہو۔

علامہ ہروی اس پر تعلیقاً قمر طراز ہیں:

يقال لمن له تلك الملكة انه عالم بذاك العلم واما الذي ليس له

تلك الملكة فلا يطلق عليه العالم بذاك العلم له

یعنی کسی علم میں صاحب ملکہ ہی پر عالم اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور جسے یہ ملکہ علمی حاصل نہ

ہو اسے عالم نہیں کہا جاسکتا۔

ایک تفسیر اور مجتہد (خواہ کسی بھی درجے کا مجتہد ہو) کے لیے تو اس ملکہ علمی، قوت تفکر اور استنباط

کی صلاحیت کا حصول اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اور اس کے لیے اسے ایک

دو نہیں بلکہ بہت سے علوم عقلیہ، علوم نقلیہ اور علوم لغویہ و بیانیہ میں یکساں مہارت اور ملکہ
راسخہ کا تحقق کرنا ہوتا ہے۔

علامہ سبکی کہتے ہیں۔

ان الاجتهاد متوقف علی ثلاثة اشياء: احدها التكيف بالعلوم التي تهذب

الذهن كالعربية و اصول الفقہ و ما يحتاج اليه من العلوم العقلية في

صيانة الذهن عن الخطاء، والثاني، الاخطاة بمعظم قواعد الشريعة

والثالث، الممارسة والتبع لمقاصد الشريعة ما يكسبه قوة يفهم

منها مراد الشارع في كل موضع له

یعنی اجتہاد تین چیزوں پر متوقف ہے۔ ایک تو ذہن کی تہذیب اور خطا سے محفوظ رکھنے

والے علوم عقلیہ میں کیفیت راسخہ کا حصول۔ دوسرے جملہ قواعد شریعت کا احاطہ۔

اور تیسرے مقاصد شریعت کا تتبع اور عمارت جس سے ہر مقام پر شارع کی مراد و دعا

کھینے کا ملکہ تحقق ہو جائے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مفتی اور مجتہد کے

لیے کس پالیے کا عالم ہونا ضروری ہے اور کیوں نہ ہو کہ مجتہد کا کام محض سطحی امور کا دیکھ

لینا نہیں بلکہ ان کی گمراہیوں میں اتر کر ان کی بنیادوں کا پتہ لگانا ہے تاکہ صلی کلیہ اور اسرار
جامعہ کا سراخ لگا کر جزوی مسائل کو ہمہ گیر بنا سکے۔

بنا بریں علمائے شریعت کے دو طبقے ہونے قدرتی ہیں۔ ایک عالم جزئیات، ایک
عالم کلیات، اور ظاہر ہے کہ جس کی نظر علم کلی تک پہنچ گئی تو اس کا علم اس ایک منصوص
جزیر تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ علمت جامعہ کے سبب ہزار ہا وہ جزئیات بھی اس پر کھل جائیں گی جو اس
منصوص حقینہ کی طرح امر کی کے عموم میں لپٹی پڑی ہوں۔ اس لیے یہ عالم کلیات ہی حقیقی معنوں
میں عالم کہلانے کا مستحق ہے اس کے برعکس عالم جزئیات اگرچہ ہزار ہا جزئیات
کا حامل ہو پھر بھی انصافاً عالم نہیں بلکہ حافظ کہلانے کا مستحق ہے لہ

ان تصریحات کی روشنی میں اگر ہم فقیہ کاسانی کے پایہ علمی، بصیرت فقہی اور قوت استدلال
واستنباط کا جائزہ لیں تو یہ یقین افروز احساس ابھرتا ہے کہ الہکاسانی علامہ سبکی کے بیان کردہ
تینوں لوازم اجتهاد سے پوری طرح آراستہ، تفقہ واستنباط کے ملکہ راسخہ کا حامل اور قوت
اجتهاد و افتاد سے شاد کام ہے۔ وہ محض حافظ جزئیات نہیں بلکہ عالم کلیات اور مستنبط
جزئیات ہے۔ بدائع الصنائع کی سطر سطر شاہد ہے کہ جزئیات سے کلیات تک رسائی
اد کلیات سے پھر نئے نئے جزئیات کا استخراج اور ان کی باہمی نسبت و کیفیت نسبت کا
کامل ادراک مصنف کی نمایاں خصوصیت ہے۔ جس قدر شریعت اسلامیہ مرتب و منظم
ہے اسی قدر فقیہ کاسانی کا ذہن و فکر منظم، ملکہ تفقہ واستنباط راسخ اور مقاصد شریعت
کا فہم کامل ہے۔ جیسا کہ آگے بدائع کے تجزیاتی مطالعہ کے ضمن میں اس کے نظائر و شواہد
بیان ہوں گے۔

بنیادی طور پر اجتهاد کی دو قسمیں ہیں۔ اجتهاد مستقل اور

۲۔ کاسانی کا پایہ اجتهاد:۔ اجتهاد غیر مستقل۔

اجتهاد مستقل کی تعریف یہ کی گئی ہے:

هو ان یتقل المجتهد یا دراک الاحکام الشریعیہ من ادلتها
 من غیر تقلید او تقید بمذہب من المذہب، بل یجتهد فی تاسیس
 اصولہ وقواعدہ من الکتاب والسنة ^{لہ} واستخراج منهاج لہ فی اجتهادہ
 ثریستقل باستنباط الاحکام علی وفق ہذا المنہاج لہ غیر منحصر فی
 باب من ابواب الفقہ ^ہ

یعنی اجتہاد مستقل یہ ہے کہ مجتہد کسی فقہی مذہب کی تقلید یا تقید کے بغیر براہ راست کتاب
 وسنت سے اپنے لیے استنباط کے اصول وقواعد اور اجتہاد کا منہاج مقرر
 کرنے کے بعد، انہی اصول استنباط کی روشنی میں فقہ کے تمام ابواب سے متعلق
 احکام کا استخراج کرے۔

اجتہاد غیر مستقل کی چار انواع یا مراتب ہیں۔ انتسابی، مذہبی، تحریجی، ترحیمی۔ اجتہاد
 انتسابی کی تعریف یہ ہے کہ:

هو ان یمارس الفقیہ المنتسب الی مجتہد آخر فی قواعد الاصول
 ومنہج الاستنباط الاجتہاد فی الوقائع علی وفق ذلك المنہاج ^{لہ}
 یعنی قواعد استنباط اور منہج اجتہاد میں کسی امام مذہب کی تقلید کرتے ہوئے، اسی کے
 اصولوں کے مطابق فروعی احکام کا استخراج اجتہاد انتسابی کہلاتا ہے۔
 اجتہاد مذہبی کی تعریف ہے۔

لہ المسودۃ فی اصول الفقہ: ص ۵۲۶

لہ ابن بدران: المدخل الی مذہب الامام احمد، ص ۱۸۴

لہ حاشیۃ العبادی علی شرح المحلی، الفکر السامی، ج ۲، ص ۳۳۲

لہ الوزیرہ: اصول الفقہ: ص ۳۱۰

لہ ابن عابدین: شرح عقود رسم مفتی، ص ۴

لہ الوزیرہ: اصول الفقہ، ص ۳۱۳ ابن بدران: المدخل الی مذہب الامام احمد، ص ۱۸۴

ہوا اجتہاد فی المسائل التي لا رواية فيها عن امام المذهب مع اتباع
الامام في الاصول والفروع التي انتهى اليها له
يعني امام مذهب کے اصول اور فروع کی پابندی کرتے ہوئے اس کے قواعد استنباط
کے مطابق ان مسائل کا استنباط جن میں امام سے کوئی روایت نہیں۔
اجتہاد تحریمی عبارت ہے۔

تفصیل قول مجمل ذی وجہیہ ا تعیین وجه معین لحکم محتمل لامرین
منقول عن صاحب المذهب أو عن اوحدا صحابه المجتہدین له
یعنی امام مذہب یا اس کے اصحاب سے منقول مجمل اقوال کی تفصیل اور محتمل روایات
کی توجیہ اصحاب تحریر کا کام ہے کیونکہ یہ لوگ احاطہ اصول مذہب اور ضبط مآخذ
کی بناء پر احکام کی علل و مبادی کے استخراج اور امثال و نظائر پر قیاس کی
قدرت رکھتے ہیں۔
اجتہاد ترمیمی سے مراد ہے:

الموازنة بين ما روى عن امام المذهب من الروايات المختلفة، و
ترجيح بعضها على بعض من جهة الرواية او الدراية^١ بسائل الترجيح
المختلفة من قوة الدليل او الصلاحية للتطبيق بموافقة اجوال العصر
ونحو ذلك مما لا يعد استنباطا جديدا مستقلا ولا تابعا له
يعني امام مذہب سے منقول مختلف روایات کے مابین موازنہ اور مختلف مسائل ترجیح
جیسے روایت، روایت، قوت دلیل، موافقت قیاس یا عصری تقاضوں کی تکمیل وغیرہ

۱۔ خلاف: خلاصتہ تاریخ التشریح مع اصول الفقہ: ص ۲۶

۲۔ حسین مخلوق: بلوغ السؤل ص ۱۸۱

۳۔ خلاف: خلاصتہ تاریخ التشریح: ص ۲۶

۴۔ ابو زہرہ: اصول الفقہ، ص ۱۵

کی بنا پر کسی روایت کو ترجیح دینا یہ تھیں اجتہاد کی اقسام، باعتبار مراتب مجتہدین کے، باقی رہا الکاسانی کے پایہ اجتہاد کا تعین تو اس سلسلہ میں یہ اساسی حقیقت اجاگر کرنا ضروری ہے کہ شریعت اسلامیہ میں اجتہاد کی اباحت و مشروعیت کی اساس ضرورت و حاجت ٹھہرائی گئی ہے کہ بفوائے حدیث معاذ رضی اللہ عنہما اور مفتی کے لیے لازم ہے کہ پیش آمدہ مسئلہ میں شرعی حکم کی جستجو پہلے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کرے اور اگر ان دونوں میں وہ مطلوبہ حکم نہ پاسکے تو پھر اجتہاد و رائے کا سہارا لے جو بقول ثعالبی اور شافعی بمنزلہ ملیتہ کے ہے اور صرف مختصر کی حالت میں روا ہے۔ علامہ ابوشامہ المقدس حافظ بیہقی سے روایت کرتے ہیں کہ:

قد كره السلف الاجتهاد قبل وقوع المسئلة لان الاجتهاد انما

ايبح للضرورة ولا ضرورة قبل الواقعة

یعنی سلف وقوع حادثہ سے پہلے اجتہاد کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ اجتہاد صرف ضرورت کے وقت جائز رکھا گیا ہے اور وقوع معاملہ سے پیشتر کوئی ضرورت درپیش نہیں۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں۔

وان لا يفتحم في الاجتهاد حتى يضطر اليه وتقع الحادثة فان الله

تعالى يفتح عند ذلك العلم عناية منه بالناس واما تهينته من

قبل فمظنة الغلط

یعنی چاہیے کہ انتہائی اضطراب اور وقوع حادثہ سے پیشتر اجتہاد کی طرف مائل نہ ہو۔

لہ خلاصہ حدیث یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پوچھنے پر حضرت معاذ نے عرض کی کہ پیش آمدہ مسئلہ کا حکم پہلے کتاب اللہ میں اور پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈھونڈ لیا اور اگر ان دونوں میں حکم نہ مل سکا تو پھر اجتہاد کر لیا۔

علامہ ابوشامہ: مختصر کتاب المومل: ص ۱۲

علامہ ابن عساکر: ص ۱۲

علامہ حجر اللہ البالغی: عربی ج ۱: ص ۱۳۷

کیونکہ ضرورت کے وقت اللہ تعالیٰ اپنی عنایت و کرم سے صحیح علم و حکم تک رسائی بخشنے
ہیں اور بغیر ضرورت استعمال اجتہاد میں غلطی و خطا کا امکان زیادہ ہے۔

شاہ صاحب کے اس قول کی توجیہ یہ ہے کہ جس طرح حکمت خداوندی جب کبھی
تمدن کے کسی خاص پہلو میں ترقی دینا پسند کرتی ہے تو چند مخصوص دماغ منتخب کر کے ان سے
زمانے کی ذہنیت اور ضرورت کے مطابق ایجاد و اختراع کا کام لیتی ہے اور ہر دور میں
موجدوں کی طبیعتیں فطرۃً تمدن کے انہی گوشوں سے متعلق ایجادات کی طرف مائل ہوتی
ہیں جن کی زیبائش کی ضرورت ہو اور جب ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو طبائع کی یہ اختراعی
واکتشافی دور بھی ختم ہو جاتی ہے اسی طرح نظام تشریح کے سلسلہ میں حکمت ربانی جب کبھی
تدین کے کسی منفی گوشے کو نمایاں کرنا چاہتی ہے تو خاص ذہنیت کے افراد پیدا کر کے ان
کے قلوب میں ذوق اجتہاد ڈال دیتی ہے چنانچہ اجتہاد کا رنگ ہر دور کی علمی ذہنیت اور
وقت کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ مجتہدین کے قلوب فطرتاً چلتے ہی اس استخراج کی
طرف ہیں جس کی اس عہد میں ضرورت ہوتی ہے اور تکمیل ضرورت کے بعد اجتہاد کا وہ دور
نہیں لوٹتا جس سے زمانہ فارغ ہو چکتا ہے۔ پس اگر عین دین میں اجتہاد کر کے استخراج عمل
کلیات اور تدوین اصول کی ضرورت ہو تو مجتہد دماغ قدرتاً ادھر ہی چلیں گے اور اگر ان
کلیات سے استنباط مسائل اور تدوین احکام کی ضرورت ہو تو مجتہدین ادھر ہی متوجہ ہوں گے
پھر اگر استخراج کردہ مسائل و احکام کو واقعات پر منطبق کر کے ترجیح و انتخاب فتاویٰ کی ضرورت
پڑے گی تو اجتہادات ادھر ہی بڑھیں گے اور جو درجہ اجتہاد پر وہ ظہور پر آجائے گا اور اس
کی ضرورت پوری ہو جائے گی تو پھر طبعی طور پر اس کے اعادہ کی حاجت نہیں رہے گی لہ

اس اعتبار سے جب ہم تاریخ اسلامی میں ادوار اجتہاد کے واقعہ اور عملی پہلو کا جائزہ
لیتے ہیں تو یہ حقیقت ابھرتی ہے کہ سلطنت اسلامی کی روز بروز وسعت کے ساتھ ساتھ

جب مختلف تہذیبوں اور تمدنوں سے تعلق رکھنے والے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے اور حالات و زمانہ کے تقاضا کی نئی نئی کروٹوں نے بے شمار سیاسی و معاشی اور اجتماعی مسائل کو جنم دیا جن کے شرعی حل پیش کرنا ضروری ٹھہرا اور براہ راست کتاب و سنت اور مصادر و شریعت سے احکام کا استنباط عوام کے لیے ممکن نہ رہا تو اللہ تعالیٰ نے امت میں وہ ارباب فقہ و روایت اور ائمہ اجتہاد پیدا کیے جن کے مصفا ذہنوں کا سرعت انتقال و نفوذ اور حیرت ناک استنباطات عذوق عادت کی صورت ظاہر ہوئے انہوں نے نہ صرف مسائل مستنبط کئے بلکہ وجوہ استنباط و قواعد اجتہاد کی تاسیس بھی کی اور کیفیت استنباط پر روشنی ڈالی۔

پوری شریعت کی جزئیات کا ان کی کلیات سے ارتباط معلوم کیا اور اس ربط کے واسطہ سے ہزاروں نئے مسائل و احکام اور ہزاروں اعلیٰ کلیہ کا استخراج کیا۔ یہ اجتہاد استقلالی کا دور تھا جب استنباط و اجتہاد کے تمام اساسی قواعد وضع ہو گئے جو قیامت تک پیدا ہونے والے تمام ممکنات پر حاوی ہیں اور امہات مسائل حقیقی تنقیح کے بعد باب و امر تب ہو گئے اجتہاد اساسی بام عروج پر پہنچ گیا اور فقہی مذاہب استقرار پذیر ہو گئے تو قدرتی عوامل کے تحت وہ خاص قوت فہم اور بلکہ استنباط بھی گھٹنا شروع ہو گیا جو اجتہاد مستقل کے لیے درکار تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اجتہاد مستقل کی ضرورت ختم ہو گئی تو بقول نووی اور شاہ ولی اللہ چوتھی صدی ہجری کی ابتداء میں اجتہاد مستقل عملاً ختم ہو گیا لہٰذا اجتہاد مستقل کے پہلو بہ پہلو اور بالخصوص اس کے انقطاع کے بعد اجتہاد انتسابی جاری رہا مگر رفتہ رفتہ تکمیل ضرورت کی بناء پر اس اجتہاد کا دائرہ بھی سمٹنا چلا گیا حتیٰ کہ پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں اس طبقہ مجتہدین کے افراد بھی شاذ و نادر ہی رہ گئے تھے اور اس کے بعد اجتہاد مذہبی، اجتہاد تخریجی اور اجتہاد تریجی کا لائقنا ہی دور شروع ہو گیا۔ چنانچہ الکاسانی اور اس کے معاصر فقہاء کی فقہی سرگرمیوں کے ایک عمومی جائزہ سے یہ حقیقت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں اجتہاد مفید کی یہ تینوں انواع پائی جاتی تھیں۔ اور

کاسانی کا پائیدار اجتہاد ان تینوں انواع استنباط سے ترکیب پاتا ہے جیسا کہ امور ذیل سے عیاں ہے۔

۱۔ معاصر فقہاء کے حوالے سے کاسانی کے اجتہادی مقام کا تعین | الکاسانی کے

چاروں فقہی مذاہب سے وابستہ معاصر فقہاء میں سے اکثر اجتہاد مذہبی اور اجتہاد تخریبی کے مرتبہ پر فائز نظر آتے ہیں۔
ذیل میں اس سلسلہ میں صرف مختصر اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

معاصر فقہائے حنفیہ | (۱) طاہر بن احمد بن عبد الرشید البخاری صاحب خلاصۃ الفتاویٰ باوراء الہزیں حنفیہ کی شیخ اور اکابر مجتہد فی المسائل (صاحب اجتہاد مذہبی) میں سے تھے تاریخ و فائز ۴۲ھ ہے۔

۲۔ محمد الدین بن شمس الائمہ النذرنجری متوفی ۵۸۲ھ اپنے باپ کی طرح شمس الائمہ کا لقب رکھتے تھے بڑے عالم فاضل اپنے وقت کے نعمان ثانی تھے۔

۳۔ ابوالسحاق ابراہیم بن اسماعیل متوفی ۶۷۷ھ قاضی خان کے استاد ہیں اور اگر نشا کرم درجہ اجتہاد فی المسائل پر فائز ہے تو خود استاد کا پایہ علمی کیا ہوگا؟

۴۔ فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی المعروف بہ قاضی خان متوفی ۵۹۲ھ طبقہ مجتہدین فی المسائل میں شمار کیے جاتے ہیں۔

۵۔ علی بن ابی بکر بن عبد الجلیل المرغینانی، صاحب ہدایہ اپنے وقت کے امام فقیہ حافظ محدث، مفسر اور محقق اصولی تھے ابن کمال باٹھانے آپ کو طبقہ اصحاب تریح سے شمار کیا ہے لیکن پاشا کی اس رائے پر تعاقب کیا گیا اور کہا گیا ہے کہ صاحب ہدایہ کی شان

قاضی خان سے کچھ کم نہیں اور وہ اپنے نقد دلائل اور استخراج مسائل کی بناء پر مجتہدین فی المذہب میں منظور ہونے کے لائق ہیں۔ آپ نے ۵۹۳ھ میں وفات پائی۔

سوال یہ ہے کہ اگر مذکورہ حنفی فقہاء مرتبہ اجتہاد فی المذہب پر فائز قرار دیئے گئے ہیں تو

ان کا معاصر اور فی الواقع اپنے ملکہ علم و تفقہ، قوت استنباط و استخراج اور منفرد طرز استدلال کی بنا پر ان سب سے بلند مرتبہ فقیہ الکاسانی جو خود تحدیث نعمت کے طور پر اپنی سبقت علمی کا اظہار یوں کرتا ہے۔

سبقت العالمین الی المعالی بصائب فکرة و علو همة
 و لاج بحکمتی نور الہدی فی لیل بالضلالة مد لہمة
 اجتہاد مذہبی کے مرتبہ پر فائز کیوں نہیں قرار پاسکتا؟ صرف معاشرت کے حوالے سے نہیں بلکہ سبقت علمی المعاصرین کی حقیقی بنیاد پر۔

معاصر فقہائے مالکیہ (۱) ابو عبد اللہ محمد بن علی المازری متوفی ۳۶۶ھ۔ آپ مایۃ ناز اصولی

اور بھر پور قوت استنباط کے حامل مالکی فقیہ ہیں اصول فقہ میں آپ سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

۲۔ ابو بکر بن محمد بن عبد اللہ المعروف بابن العزبی م ۵۵۳ھ صاحب تفسیر احکام القرآن یقیناً اجتہاد مذہبی کے درجہ پر فائز مالکی فقیہ اور بلند پایہ مفسر ہیں۔

۳۔ قاضی ابوالفضل عیاض بن موسیٰ الجصبی متوفی ۱۱۵۶ھ۔ زبردست قوت استدلال سے بہرہ ور نہایت زاہد متقی اور عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم فقیہ ہیں۔

۴۔ ابن رشد الحفید متوفی ۵۹۵ھ مایۃ ناز فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ اعظم فقیہ بھی ہیں۔ آپ کے پایۃ اجتہاد کا اندازہ آپ کی فقہی تصنیف "بداية المجتهد ونهاية المقتصد" سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

معاصر فقہائے شافعیہ (۱) حجة الاسلام الغزالی، آپ کا نام ہی فقہ، اصول، تصوف و اخلاق

اور فلسفہ و حکمت میں رمز عظمت بن گیا ہے، آپ کا مرتبہ اجتہاد اصول میں المستصفا اور ذروع میں الوجیز سے عیاں ہے۔

- ۲- ابواسحاق العراقی متوفی ۵۹۶ھ مصر کی جامع العتیق کے امام و خطیب تھے المہذب کی شرح لکھی جس سے آپ کی فقہی عظمت و بصیرت واضح ہو جاتی ہے۔
- ۳- ابوسعید عبداللہ المعروف بابن عسرون متوفی ۵۵۳ھ دمشق کے قاضی القضاة مقرر کیے گئے فقہ میں بہت سی کتابیں لکھیں مثلاً صفة المذہب، کتاب الانتصار الذریعہ فی معرفۃ الشریعۃ، وغیرہ۔ آپ یقیناً اجتہاد مذہبی کے مقام پر فائز ہیں۔
- ۴- ابوالقاسم عبدالکریم القزوینی السافی متوفی ۶۲۳ھ فقہ میں عمدۃ المحققین مانے گئے ہیں، اور آپ کے استنباطات و تخریجات فقہ شافعی میں پورا پورا اعتبار پاتے ہیں۔

معاصر فقہائے حنابلہ | (۱) الشیخ عبدالقادر الجیلانی المعروف ریغوث اعظم م ۵۶۱ھ تصوف و طریقت کے شہباز فقہ میں مذہب حنبلی کی عمومی پیروی کے ساتھ آزادانہ اجتہادی فتاویٰ صادر فرمایا کرتے تھے اس لیے آپ کا مرتبہ اجتہاد مذہبی سب سے بھی اوپر ہے۔

۲- ابوالفرج ابن الجوزی م ۵۹۷ھ مایہ نازفقہ، محرث، مؤرخ اور واعظ و مبلغ۔ المنتظم صفة الصنفۃ اور تلبیس ابلیس جیسی شہرہ آفاق کتابیں لکھیں۔ یقیناً فقہ حنبلی میں اجتہاد فی المسائل کا درجہ رکھتے ہیں۔

۳- ابن المارستانی متوفی ۵۹۹ھ معروف حنبلی عالم اور تخریج و ترجیح کی قدرت سے بہرہ ور فقہیہ ہیں۔

۴- محمد بن عبداللہ السامری متوفی ۶۱۶ھ کتاب المستوعب اور کتاب المفروق کے مصنف عظیم حنبلی عالم اور فقہیہ ہیں۔

یہ تھے الکاسانی کے چند مایہ ناز معاصر فقہاء جن کی کثرت اپنے اپنے مذہب میں اجتہاد فی المسائل اور اجتہاد تخریجی کے مرتبہ پر فائز نظر آتی ہے اور اگر ہم بدائع الصنائع کی روشنی میں الکاسانی کی فقہی بصیرت و حکمت، توت استنباط مسائل و علل اور طرز استدلال و تدوین کا جائزہ

ہیں، جیسا کہ آگے چل کر ایک اجمالی و عمومی تجزیہ پیش کیا جائے گا، تو یہ حقیقت کا شمس ہو جاتی ہے کہ کاسانی کا پایہ اجتهاد اپنے معاصر فقہائے اسلام سے کسی صورت کم تر نہیں بلکہ اکثر معاصرین سے وہ ہر اعتبار سے بہت زیادہ بلند نظر آتا ہے۔ اور بناء بریں ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ کاسانی یقیناً اجتهاد مذہبی کا درجہ رکھتا ہے۔

ب کاسانی کی تالیفات اور فتاویٰ اس کے پایہ اجتهاد پر استدلال کے علی

دعویٰ کا رناموں کا تفصیلی جائزہ آگے آ رہا ہے۔ یہاں ہم صرف موصوف کی تالیف بدائع الصنائع اور فتاویٰ کی روشنی میں اس کے پایہ اجتهاد کا تعین کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بدائع کی تمام موضوعی خصوصیات، جو آگے بیان ہو رہی ہیں، اس امر پر شاہد عدل ہیں کہ مصنف نہ صرف تفقہ اور استنباط مسائل کے ملکہ سے بہرہ ور ہے بلکہ وہ استخراجِ علل و کلیات تک رسائی ان کی باہمی نسبت و کیفیت نسبت کے ادراک اور ہر حکم کے خصوصی اور عمومی مقاصد و اسرار و تشریحیہ سے آگہی کی بھی پوری پوری قدرت رکھتا ہے اور یقیناً کاسانی اپنے فتاویٰ میں یہی روش اپنائے ہوئے ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اجتهاد مذہبی بلکہ اس سے بھی اوپر کے مرتبہ پر قائم فقیر کا مقام ہے۔

ایک مفتی کے لیے اجتهاد فی المسائل کی قدرت رکھنا اولیٰ شرط ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اور یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ کاسانی کے دور میں کوئی فتویٰ اس وقت تک معتبر نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک اس پر کاسانی کے استاذ، علامہ کی بیوی اور خود کاسانی کے دستخط ثبت نہ ہوں۔ اس سے عیاں ہے کہ کاسانی کے اجتهادی مرتبہ کا اعتراف اس دور کے سبھی لوگوں کو تھا۔ اور آئندہ ہمیشہ کے لیے بدائع الصنائع مصنف کے پایہ اجتهاد کی شاہد عدل ہے

الکاسانی کی علمی اور عملی خدمات ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ ملت اسلامیہ کے عمومی انخطاط کے دور میں احیائے اسلام اور ملی شخص کی بحالی

کے لیے قدرت نے جن جامع اور ہمہ گیر ذوات قدسیہ کا انتخاب فرمایا، الکاسانی ان میں امتیازی حیثیت کی حامل شخصیت ہے جس نے اپنی زندگی تہذیب اسلامی کی علمی اور شرعی پوزیشن کے

ابدی تحفظ اور انقلابی اسلامی نظام تعلیم و تربیت کی آبیاری کے علاوہ افراد قوم کی تعمیر سیرت کے لیے وقف کر دی تھی یہی وجہ ہے کہ الکاسانی کی ملی اور تہذیبی خدمات میں جامعیت اور ہمہ گیریت پائی جاتی ہے۔ وہ بیک وقت ایک عظیم مدرس، معمار تہذیب بھی ہیں ایک مایہ ناز فقی کی حیثیت نفاذ عدل کا اک مستقل ادارہ بھی اور ایک شہرہ آفاق مصنف کی حیثیت سے ملت کے فکری رہنما بھی۔ ان کی تنہا ذات نے اتنی عظیم الشان علمی اور عملی خدمات انجام دے ڈالیں جو حقیقت میں ایک بڑی جماعت کی منظم کوششوں ہی سے تکمیل پاسکتی تھیں۔ ذیل میں ہم الکاسانی کی چند نمایاں علمی اور عملی خدمات کا مختصر جائزہ لیں گے۔

اولاً: تعلیم و تربیت | اسلام سرِ ابا دین علم ہے علم کے بغیر اسلام کا تصور ہی نہیں ہو سکتا کہ اجزائے ترکیبی ایک ہی ہیں جو قرآن حکیم کی آیت **لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولَدُوا وَجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ... أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ** میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں یہ عناصر حیات اور اجزائے تعلیم تین ہیں

۱۔ صحت عقیدہ جو مرکزی تصور حیات سے عبارت ہے۔

۲۔ حسن معاشرہ یعنی مرکزی تصور حیات کا معاشرہ سے تعلق اور۔

۳۔ تہذیب نفس جس سے مقصود ہے ظاہر و باطن کا تزکیہ اور شخصیت و کردار کی تعمیر۔

اسلام نے علم کو جو عزیز معمولی بلکہ فوق الكل وقعت و اہمیت دی ہے اس کا اولین تقاضا ہے کہ معاشرے میں علم کی نشر و اشاعت اور تبلیغ و توسیع کے لیے تمام انفرادی و اجتماعی وسائل بروئے کار لائے جائیں اور ان تمام عناصر و عوامل کا سدباب کر دیا جائے جو اس راہ میں حائل ہوں کیونکہ جس معاشرے میں علم کی ضد جہالت جس نسبت سے موجود ہوگی وہاں اسی نسبت سے علم کی عظمت و افادیت مجروح ہوگی یہی وجہ ہے کہ اسلام نے فروغ علم کو نہ صرف حکومت اسلامیہ بلکہ ہر فرد ملت کا دینی فریضہ قرار دیا ہے۔ ارشاد خداوندی:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَ
لِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ۔

یعنی ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ان میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے تاکہ واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو اس علم کے ذریعہ ڈراتے کہ وہ خدرو احتیاط اپناتے، سے عیاں ہے کہ حصول علم کی غرض ہی یہ ہونی چاہیے کہ اسے آگے پھیلا یا جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رفاه عامہ کی خاطر بے غرض حصول علم اور بے لوث اشاعت علم پر جس قدر زور دیا اس کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شان یہ بیان فرمائی کہ:

انما بعثت معلما یعنی مجھے تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ آپ نے فروع علم کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا مستحق لوگوں کو علم سکھانا صدقہ اور اللہ کے تقرب کا ذریعہ ہے۔ حصول علم اور تعلیم و تدریس میں غفلت برتنے والوں کو تنبیہ کرتے ہوئے ایک روز فرمایا: کیا ہو گیا ہے ایسے لوگوں کو جو اہل علم ہیں مگر اپنے پڑوسیوں کو علم نہیں سکھاتے؟ اور کیا ہو گیا ہے ایسے لوگوں کو جو جاہل ہیں اور اپنے اہل علم پڑوسیوں سے تعلیم حاصل نہیں کرتے؟ خدا کی قسم! یہ دونوں طبقے اگر اسی طرح غفلت شعار رہے تو عذاب الہی جلد ہی انہیں دہلویج لے گا۔ (راوکما قال علیہ السلام) حضرت انسؓ کا ارشاد ہے کہ ”مجھے علم ہوا ہے قیامت کے دن علماء سے اشاعت علم کے بارے میں اسی طرح سوال ہو گا جس طرح انبیاء کرام سے تبلیغ رسالت کے بارے میں۔“

فروع و اشاعت علم کی اسی اہمیت کے پیش نظر اسلام میں معلمی کو سب سے اعلیٰ درجے اور محترم و باوقار پیشہ مٹھرایا گیا ہے۔ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے،
خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ۔

یعنی تم میں بہترین شخص وہ ہے جو قرآنی علوم (اور کیفیت یہ ہے کہ صحیح العلم فی القرآن) کو سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔ امام باقرؑ کا قول ہے: جو شخص علم سکھاتا ہے اسے طالب علم کے برابر اجر ملتا ہے اور اسے طالب علم پر فضیلت بھی حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں

نے ہمیشہ ہر دور اور ہر علاقے میں انفرادی و اجتماعی سطح پر علم کی اشاعت اور تعلیم و توسیع کے لیے خصوصی اقدامات کیے اور کبھی اپنے اس دینی و ملی فریضہ سے ذرا غفلت نہ برتی۔ چنانچہ ایک طرف ترجمہ و تالیف کے ذریعہ فروع علم و حکمت کی کوششیں ہوتی رہیں اور دوسری طرف تعلیم و تدریس کے بیسیوں مختلف مراکز قائم کیے گئے جہاں نسل در نسل اور مذہب کے اختلافات سے بالاتر رہتے ہوئے تمام متلاشیان علم سیراب ہوتے رہے۔ پانچویں صدی ہجری کے وسط تک تعلیم کسی ایک مقام پر محدود نہ تھی بلکہ مختلف قسم کے کثیر مقامات و مراکز پر جاری تھی مثلاً ابتدائی تعلیم کے لیے مکاتب و محلات، کتب فروشوں کی دکانیں، علماء کی قیام گاہیں، مساجد و خانقاہیں، ادبی نشستیں، محلات شاہی اور بادیہ وغیرہ۔ لیکن سلجوقیوں کے عہد میں ۵۹۰ھ سے تعلیم و تربیت اسلامیہ کا ایک نیا انقلابی دور شروع ہوا جب الپ ارسلان اور ملک شاہ کے روشن خیال وزیر نظام الملک طوسی نے جدید نظام تعلیم کے تحت بغداد میں پہلا مدرسہ نظامیہ قائم کیا اور اس کے بعد خلافت اسلامیہ کے طول و عرض میں مدارس کا ایک جال بچھنا شروع ہو گیا اس سلسلہ میں نظام الملک کی پیروی کرنے والوں میں سب سے نمایاں بہتقی نور الدین زنگی کی ہے جس نے ۵۲۲ھ میں تخت نشین ہوتے ہی اپنی سلطنت کے بڑے بڑے شہروں میں نظامیہ کے طرز پر مدارس قائم کرنا شروع کر دیئے اور یہ سلسلہ اس کی وفات یعنی ۵۶۹ھ تک جاری رہا۔ الکاسانی اسی حکمران نور الدین زنگی کے دربار میں سلجوقی سفیر کے طور پر بھیجے گئے تھے آپ کے شہر اقامت حلب کے نمایاں مدارس الحلاویۃ، المعصومیۃ، الفوریۃ اور الشیبیۃ تھے۔ مدرسہ الحلاویۃ میں رضی الدین السرخسی تدریس کے فرائض انجام دینے پر مامور تھے لیکن طلبہ ان سے قوت بیانی میں ایک نقص کی وجہ سے بہت غیر مطمئن تھے۔ اس لیے علمائے حلب نے نور الدین سے الکاسانی کو اس منصب پر مقرر کرنے کی درخواست کی جسے منظور کر لیا گیا اور آپ کو السرخسی کی بجائے مدرسہ الحلاویۃ میں تعلیم و تربیت کے عظیم مشن پر مامور کر دیا گیا۔ ۲

الکاسانی کا طریق تدریس اور منہاج تربیت اپنی روح کے اعتبار سے یقیناً وہی تھا جو امت میں متواتر چلا آ رہا تھا لیکن جس میں اب مدارس نظامیہ کے قیام کا بعد شکلیاتی اور ہستی لحاظ سے انقلابی تبدیلیاں لائی جا رہی تھیں اور چونکہ الکاسانی کے عہد میں ہنوز اس نئے نظام تعلیم و تربیت کا آغاز تھا اس لیے ہمارا احساس ہے کہ قدرت نے اس عظیم عمارت کی خشت بندی کے لیے علماء مذہب و مدرسین اور مصنفین کی جس مقدس جماعت کو تیار کیا ان میں الکاسانی نہ صرف شامل بلکہ امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ ذیل میں ہم الکاسانی اور اس کے معاصرین کے ہاتھوں تشکیل پانے والے جدید نظام تعلیم و تربیت اسلامیہ کے چند نمایاں خدوخال بالخصوص الکاسانی کے حوالے سے بیان کریں گے تاکہ ان کی عملی خدمات کا یہ اجمالی جائزہ عہد حاضر میں نظام تعلیم و تربیت کی تشکیل نو میں کسی قدر رہنمائی کا کام بھی دے سکے۔

۱۔ علم کی مقصدیت و افادیت: اسلامی تصوریات کے مطابق زندگی کا نصب العین ہے اور اک، شعور کائنات اور معرفت

خالق، حیات و کائنات کے شعور و آگہی اور ادراک و شناسائی کے بہ راستے کی منزل آخر میں معرفت خالق ہے۔ اور یہی اسلامی تصور علم و تعلیم کی بھی غایت الغایات ہے اسلام میں علم و معرفت کا ہر جاوہ اور ہر کاوش عرفان باری کی نقاب کشا ہے۔ کہہ۔

ہے چہ چشمے کہ روئے دوست ز بند بطلت است علم کہ راہ حق ز نماند جمالت است۔

الکاسانی کا نظریہ تعلیم اسی حقیقی مقصدیت و غایت سے سرشار ہے پیچھے ہم الکاسانی کے طبعی اوصاف کے ذیل میں سوز عشق کے حوالے سے اس مقصدیت کے بعض مظاہر بیان کر آئے ہیں۔ بدائع کے حصہ عبادات میں بالعموم اور باب الصلوٰۃ میں بالخصوص، معرفت و عبودیت کو باہم لازم و ملزوم ثابت کرتے ہوئے انسانی زندگی کے جملہ مظاہر و عوامل کو عبودیت کا پابند قرار دیتے ہیں لکھتے ہیں:

ان الصلوٰۃ وکل عبادۃ خدمۃ الرب جل جلالہ وخدمۃ المولوی
علی العبد لا تكون الا فرضا اذ التبرع عن العبد علی مولاہ
محال والعزیمۃ ہی شغل جمیع الاوقات بالعبادات

بعد الامکان وانتقاء الحرج الا ان الله تعالى بفضله وكرمه جعل
لعبد ان يترك الخدمة في بعض الاوقات رخصة له

یعنی نماز اور ہر عبادت اپنی نوعیت کے اعتبار سے رب کریم کی خدمت کا رنگ رکھتی ہے اور بندے پر آقا کی خدمت فرض ہی ہوا کرتی ہے کہ یہاں بندے کا بترع ممکن نہیں اور عزیمت تو یہ ہے کہ انسان کے تمام اوقات و اعمال بشمول وقت تعلیم، عبادت کے رنگ میں رنگے ہوں البتہ خدا نے اپنے فضل و کرم سے بندے کو بعض اوقات عبادت کی ظاہری رسوم کی ادائیگی سے استثناء کی رخصت عطا فرمادی ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ کاسانی انسان کے تمام اوقات اور اعمال بشمول عمل تعلیم و تربیت کو عبادت کے لیے وقف کیے رکھنے کا قائل ہے اور یہیں سے موصوف کے نظریہ تعلیم پر مقصدیت و افادیت کے غلبہ کا یقان حاصل ہو جاتا ہے۔

ب: تعلیم و تربیت کی یکجائی اور توازن | اسلامی تصور حیات کی ایک بنیادی خصوصیت
اجزاء اور شعبہ جات کی شیرازہ بندی اگر اسلامی نظریہ حیات کا ایک نمایاں وصف ہے تو
تعلیم و تربیت کا حسین امتزاج اسلامی تصور علم کا بنیادی پتھر معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم
نے تعلیم کتاب کے ساتھ ساتھ اپنی پاکیزہ محبت، فیض تاثیر اور حسن تدبیر سے تشریح و قلوب بھی
فرمایا امت کا بھی یہی فرض تھا اس لیے مسلمانوں نے ہمیشہ تعلیم کو ایک جامع نظام کی حیثیت
سے دیکھا یعنی ایک طرف تعلیم کو نفس انسانی کی تربیت و تکمیل کا ذریعہ بنایا اور دوسری جانب
اسے فرد و اجتماع کی خدمت و بہبود کا بھی وسیلہ قرار دیا۔ زندگی کی خارجیت اور باطنیت کے
اسالیب کی یکجائی اور توازن اسلامی نظریہ تعلیم کا اساسی وصف ٹھہرا۔ خلافت اسلامیہ کے طول
و عرض میں قائم ہونے والے مدارس نظامیہ اور دیگر علمی و بتانوں کی خصوصیت وہی زندگی کی
ہمہ گیری، دین و دنیا کی وحدت، مادہ و روح کا اشتراک اور علم میں عدم مقامیت تھی۔ اس

ہمہ گیر تصور کے تحت جو تعلیمی رجحان اور علمی ذوق ابھرا اور پھیلا اس میں ہر جگہ جامعیت اور کلیت کی روح جاری و ساری نظر آتی ہے۔

اور یقیناً الکاسانی اپنے دوستان میں اسی جامعیت کلیت اور توازن سے آراستہ نظام تعلیم کو عملاً نافذ کیے ہوئے تھے جیسا کہ بدائع میں ان کے تربیتی انکار سے عیاں ہے، اس سلسلہ میں تفصیل آگے بدائع کے تجزیاتی مطالعہ کے ضمن میں آرہی ہے۔ کاسانی اس امر سے پوری طرح آگاہ تھے کہ تعلیم و تربیت کا اصل اثر دل و دماغ پر ہوتا ہے اور قلب کے بعد دوسرے اعضاء و جوارح پر اثر پڑتا ہے اور قلبی قوتوں کے ذریعہ ہی ہر حرکت عالم وجود میں متشل ہو کر سرزد ہوتی ہے جیسا کہ حدیث پاک:

الا ان في الجسد مضغة اذا صلحت، صلح الجسد كل و اذا فسدت، فسدت الجسد كله الا وهي القلب

سے عیاں ہے۔ لہذا ایک استاد اور تربیت کنندہ کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ توجہ طالب علم کی فکری اور اخلاقی استعداد کی بالیدگی اور استحکام پر دیں۔ اور اسے

ایسی تعلیم دے جو ظاہر کے ساتھ باطن کو بھی بدل ڈالے اس سلسلہ میں تعلیم کے دوران عملی نیکی کی ریاضت بھی کرائے تاکہ طالب علم کا دل گھل کر نیکی کے لیے طبیعت میں ایک خود درو۔
آبادگی پیدا ہو سکے کا نٹ نے سچ کہا ہے کہ "The best way to comprehend is to do."

الکاسانی نمایاں احساس ان کے فکر اور عمل دونوں سے عیاں ہے چنانچہ انہوں نے طلبہ کی اس ہنجیر تربیت کی تھی کہ وہ ان کی عدم موجودگی میں بھی طلب علم کے جذبہ سے سرشار ہو کر نہایت اطمینان اور ضبط و انقیاد کے ساتھ استاد کے انتظار میں بیٹھے رہتے۔ الجواہر المفضیہ میں ہے:

فولى السلطان صاحب البدائع الحلاوية عوضه يطلب الفقهاء
ذالك متله فتلقاته الفقهاء و كانوا في غيبته يبسطون له السجادة

و یجلسون حولہا فی کل یوم الی ان یقدم لہ
یعنی فقہاء نے الکاسانی کو مدرسہ حلاویہ میں نہایت جوش و جذبہ سے بطور استاد قبول کیا وہ
استاد کی غیور موجودگی میں اس کے لیے مسند بچھا کر نہایت اطمینان سے پورا پورا دن انتظار میں بیٹھے
رہتے تا آنکہ استاد آجاتا: یقیناً طلبہ میں اس قدر احترام اور نظم و ضبط بغیر حسن تربیت کے پیدا
نہیں ہو سکتا: تعلیم و تربیت کا محور قلب انسانی کو ٹھہرانے کے سلسلہ میں کاسانی کا یہ بیان قابل
غور ہے:

انہ تعالیٰ امر یغسل ہذہ الاعضاء الظاہرۃ من الحدت والجنابۃ
تذکیر التطہیر الباطن من الغش والحسد والکبر وسوء الظن
یا المسلمین وغو ذلک من اسباب المآثم... فأمر یغسل ہذہ الاعضاء
الظاہرۃ دلالة وتنبیہا علی تطہیر الباطن من ہذہ الامور وتطہیر
النفس عنہا واجب بالسمع والعقل لہ

یعنی اللہ تعالیٰ نے وضو میں ظاہری اعضائے جسم کو دھونے کا حکم درحقیقت باطن اور
قلب کو گناہ آلود جذبات و افکار سے پاک رکھنے کی ضرورت پر دلالت و تنبیہ کے لیے دیا ہے۔

اور نفس کو ان باطنی آلودگیوں سے پاک کرنا شرح اور عقل دونوں کی زور سے واجب ہے۔ گویا
کاسانی ظاہری زندگی سے متعلق تمام اعمال و احکام کو درحقیقت قلب و نفس کے تزکیہ و تعمیر کا
خارجی مظہر قرار دے رہے ہیں جس سے ان کا تصور تعلیم و تربیت بھی پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے
کہ ان کے نزدیک تعلیم کا اصل محور و محل قلب انسانی کی اصلاح و تطہیر ہے اور ظاہری انسانی
استعدادات کی نشوونما اس کا خارجی مظہر۔

ج: دائرہ علم کی وسعت | اسلامی تصور علم بے پناہ وسعت و فراخی کا حامل ہے وہ حصول تعلیم کے حق کو کسی بھی زاویے اور کسی بھی پہلو سے محدود و تنگ دائرہ میں محصور نہیں کرتا۔ اسلام میں علوم و فنون کی اس وسعت و جامعیت اور ہمہ گیری کے تین بنیادی رخ ہیں۔ اور یہ تینوں رخ ہیں الگ الگ کے نظریہ تعلیم و تربیت میں پوری طرح سمائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

۱۔ اسلام میں ہر قسم کے علوم خواہ وہ حیاتیاتی اور طبیعیاتی نوعیت کے ہوں، نفسیاتی اور عمرانیاتی طرز کے یا اخلاقی اور دینیاتی نوعیت کے سبھی ایک واضح اور متعین نصب العین کی خاطر ضروری اور اہم ہیں ارشاد خداوندی: **واعد والحمد ما استطعتم من قوۃ** سے عیاں ہے کہ ارتقاء زندگی و عصری تغیرات اور اختلاف المذہب و احوال کے پیش نظر ہر دور اور ہر علاقے کے تمدنی و تمدنی تقاضوں کی تکمیل کے لیے اور نئے نئے علمی و عملی نظریات و فنون اور ارتقائی تصورات سے غمگنہ برآہونے کے لیے متعلقہ ضروری علوم و فنون سے آراستگی لابدی و لازمی امر ہے۔ چنانچہ اس پہلو سے جب ہم الگ الگ کے تصور علم کا جائزہ لیتے ہیں تو بدائع الصنائع ہمارے سامنے ایک مجموعہ علوم و فنون اور ذخیرہ افکار و تصورات مختلف کی حیثیت سے مصنف کے نظریہ علم کی وسعت آشکار کر دیتی ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیل آگے آرہی ہے تاہم ان کے ہاں تعلیم کی یہ وسعت، علوم دینیہ کی مرکزیت پر مبنی ہے یعنی کاسانی کے نزدیک تمام علوم قدیمہ و جدیدہ کو دین فہمی کے لیے مرکوز کر دیا جانا ضروری ہے کہ تمام اہتمام علوم کی تعلیم کا مقصد خدا و دین فہمی اور رضائے الہی کا حصول ٹھہرے یہی وجہ ہے کہ الگ الگ ہمیں بدائع الصنائع میں مختلف طبعی، حیاتیاتی اور عمرانی و نفسیاتی علوم کو احکام شرعیہ کے استنباط و تفہیم کے لیے بڑی آرازدی اور خوبصورتی سے برتتے نظر آتے ہیں۔

۲۔ اسلامی تصور علم کی وسعت و ہمہ گیریت کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس میں حصول علم و معرفت کے ذرائع اور وسائل ہر اعتبار سے لامحدود ہیں چنانچہ ایک طرف حصول علم کے لیے

حواس ظاہری کے متنوع استعمال یعنی تعقل و تدبیر ذاتی مشاہدہ و تجربہ سے حصول علم اور دوسروں سے سماعت کے ذریعہ حصول معلومات پر زور ہے تو دوسری جانب حواس باطنی کو کشف و وجدان کے ذریعہ حصول علم و معرفت کا وسیلہ ٹھہرایا گیا ہے اور تیسری طرف ہر قدم پر وحی کے ذریعہ الٰہی رہنمائی کو لازماً حیات اور معیار ہدایت و صداقت کی حیثیت سے حقیقی ذریعہ علم و معرفت قرار دیا گیا ہے۔ اور قرون وسطیٰ کے اسلامی نظام تعلیم و تربیت میں ان تمام ذرائع علم کو پوری طرح استعمال کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ ہمارے ممدوح الکاسانی کا نظریہ تعلیم بھی جملہ ذرائع حصول معرفت کے بلے دریغ مگر متوازن استعمال پر مبنی ہے جیسا کہ بدائع الصنائع میں مصنف کے متنوع طرز استدلال سے جو مذکورہ سبھی وسائل علم و حجت کو محیط ہے، پوری طرح عیاں ہے۔ تفصیل آگے بدائع کے تجزیاتی مطالعہ کے ضمن میں آرہی ہے۔

۳۔ اسلامی نظریہ تعلیم کی جامعیت و آفاقیت کی تیسری جہت ہے علم کی عدم مقامیت اور غیر طبقہ و اربیت۔ یعنی ایک طرف اسلام نے ہر ثقافت کو ایک مخصوص طبقہ افراد کے تسلط سے نکال کر ہر طبقے اور ہر نسل کے ہر فرد کو بلا امتیاز رنگ و نسل و مذہب ہر قسم کے علوم حاصل کر کے ترقی کرنے کے پورے پورے مواقع فراہم کیے اور دوسری جانب علم کو نور کی طرح مشرق و مغرب کی قید سے آزاد کر کے کل انسانیت کا مشترک ورثہ قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر دور اور بالخصوص قرون وسطیٰ کے ہر اسلامی مدرسہ میں تمام طبقوں اور تمام مذاہب و اقوام کے افراد، ہر مذہب و ملت کے علوم و فنون ایک حسین امتزاج و توازن کے ساتھ حاصل کرتے تھے۔ اور یقیناً الکاسانی کے مدرسہ الجلاویۃ کا بھی یہی حال تھا۔

الکاسانی کے ہاں علم کی عدم مقامیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بدائع میں تمام فقہی مذاہب کے تصورات و افکار پوری فراخ دلی کے ساتھ تمام جزئیات،

اعراض و ابعاد اور تمام توجیہات سمیت تفصیل سے بیان کرنے کے بعد ان کے مبادی استدلال بھی پورے زور و قوت سے پیش کرتے ہیں اور پھر آخر میں ان پر محکمہ کرتے ہوئے اپنا موقف اجاگر کرتے جس سے عیاں ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو بھی اسی انداز سے پڑھاتے ہوں گے اور فقہی مذاہب کے اس انداز سے تفصیلی تقابل مطالعہ کے ذریعہ یقیناً طلبہ میں ملکہ تفرقہ و استدلال اور گہری توسمی و انتقادی نظر پیدا ہوتی ہے جو تعلیم کا حقیقی فکری مقصود ہے۔

۲۔ تعلیم کے سماجی اور انسانیاتی رخ تعلیم سے مراد وہ مسلسل اور ہمہ گیر تہذیبی عمل ہے جس کے ذریعہ مردوں اور عورتوں کی

نسلیں یکے بعد دیگرے اپنے ملی نصب العین اور قومی طرز حیات سے کامل وفاداری اور نظری عقائد و تصورات سے فکر و عمل کی مکمل مطابقت کی بنیادوں پر اپنا اپنا مقام حاصل کرتی ہیں۔ اس حقیقی عمرانی مفہوم کی رو سے تعلیم ایک ددر رس سماجی ادارہ ہے جو کل زندگی کا قائم مقام ہے لہذا تعلیم کی آخری صحیح منزل فرد اور سماج کی کل زندگی کو نہ صرف متاثر کرنا ہے بلکہ اسے سنوار کر باثروت، بامعنی اور انسانیت اور ذات کے لیے خوشگوار بنانا ہے۔ اور فی الواقع تعلیم سے زیادہ کوئی چیز سماجی انقلاب میں زیادہ اہم کردار ادا نہیں کر سکتی۔ بقول جی۔ ایچ۔ ویلز: کوئی فاتح سماج کی بنیادی حالت میں اتنا نمایاں تغیر نہیں پیدا کر سکتا، کوئی مبصر سیاست دنیاوی کاروبار کو اپنے سماج کے خیالات اور اس کی صلاحیتوں سے ماوراء نہیں کر سکتا لیکن معلمین فاتح سیاست دان سے کہیں زیادہ متاثر کر سکتے ہیں وہ ایک نقطہ نظر پیدا کر کے انسانیت کی خوابیدہ اور دبئی ہوئی صلاحیتوں کو آزادی کا پیغام سنا سکتے ہیں۔

مدارس نظامیہ کے سلسلہ سے جو علمی تحریک الکاسانی کے عہد میں شروع ہوئی وہ تعلیم کے

بڑے واضح سماجی اور انسانیاتی (Humanistic) رخ لے ہوئے تھے اور اس

کے بعد اسلامی نظام تعلیم و تربیت ہمیشہ اس تہذیبی روح سے سرشار رہا۔ ہر علم و فن حتیٰ کہ فقہ ایسے خالص مذہبی علم کی تدریس میں بھی عمرانی پہلوؤں پر زور دیا جاتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ فقہی استبطا اور تحقیق فقہ پر استقرائی انداز غالب آگیا۔ اقبال کہتے ہیں: "قرن اول کے تقریباً وسط سے لے کر قرن چہارم کے آغاز تک عالم اسلام میں فقہ و قانون کے کم از کم ۱۹ مذاہب کا ظہور ہو چکا تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ فقہاء متقدمین نے ایک بڑھتے ہوئے تمدن کی ضروریات کے پیش نظر کس سی اور جدوجہد سے کام لیا۔ بات یہ ہے کہ فتوحات میں تو وسیع اور اضافے کے ساتھ ساتھ جب عالم اسلام کے مطمح نظر میں بھی وسعت پیدا ہوئی تو اس سے فقہائے متقدمین کو بھی ہر معاملے میں وسعت نظر سے کام لینا پڑا وہ مجبور ہو گئے کہ جو فقہ میں اسلام قبول کر رہی ہیں ان کے عادات و خصائل اور مقامی حالات کا مطالعہ کریں یہی وجہ ہے کہ جب اس وقت کی سیاست اور ملی تاریخ کی روشنی میں ہم ان مذاہب فقہ پر نظر ڈالتے ہیں تو اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ اپنے سلسلہ تعبیر و تاویل میں استخراج کی بجائے رفتہ رفتہ استقرائی منہاج اختیار کرتے چلے گئے اے الکاسانی کی فقہی تالیف بدائع الصنائع کے حصہ معاملات اور باب قضاء و سیر کا مطالعہ کریں تو مذکورہ حقیقت کا یقین افزودہ مشاہدہ ہو جاتا ہے یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے، تفصیل آگے آ رہی ہے۔ عقدا جا رہے کے جواز کے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وبہ تبين ان القياس متروك لان الله تعالى انما شرع العقود
لحوایج العباد و حاجتهم الى الاجارة ماسة... تحقیقہ ان
الشرع شرع لكل حاجة عقدا یختص بها شرع لتمليك العین
بعوض عقدا و هو البیع و شرع لتمليکها بغير عوض عقلا و هو الهبة و شرع
لتمليك المتفعة بغير عوض عقدا و هو الاعارة فلو لم یشرع الاجارة
مع امتساک الحاجة اليها لم یجد العبد لذق هذه الحاجة سبيلا و هذا خلاف موضوع
الشرع لہ

لہ اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۲۵۵ لہ بدائع الصنائع، ج ۲، ص ۱۷۴

لہ بدائع الصنائع، ج ۲، ص ۱۷۴

یعنی جو اجارہ کے سلسلہ میں قیاس متروک اور استخوان معمول بہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے ہر انسانی حاجت کی تکمیل کے لیے ایک مخصوص عقد و صورت و معاملہ مثلاً بیع برائے تملیک عین بعوض، ہبہ برائے تملیک عین بلاعوض، اور اجارہ برائے تملیک منفعت بلاعوض مقرر فرمایا ہے تو اگر تملیک منفعت بعوض کے لیے عقد اجارہ کو جائز نہ رکھا جاتا حالانکہ لوگوں کو اس کی شدید حاجت ہے تو ایسے میں بندوں کے لیے اپنی اس ضرورت کی تکمیل کی اور کوئی عیبیل باقی نہ رہتی اور یہ وضع شریعت کے خلاف ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ کاسانی ہر حکم شریعت کو سماجی رُخ سے دیکھتا اور اس کی عمرانی بنیادیں متعین کرتا ہے جیسا کہ نکاح و رضاعت اور حضانت میزہ کے مسائل سے اس کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ بناء میں یہ سطلے شدہ امر ہے کہ الکاسانی اپنے نظام تعلیم و تربیت میں علم کے مذہبی اور روحانی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کی عمرانی اور سماجی جہات کا بھی پورا پورا خیال رکھتا ہے اور تعلیم کو ایک سماجی و عمرانی ادارہ کے طور پر ترمیم و تمدن کی تشکیل میں بھرپور اہمیت دیتا ہے۔

ہم: منہاج تعلیم و تربیت | اسلام نے حصول تعلیم اور فروغ علم کے لیے ایک واضح منہاج اور متعین اسلوب عطا فرمایا ہے۔ عہد کاسانی میں سلسلہ

مدارس نظامیہ کے قیام سے یہ منہاج تعلیم و تربیت عملی رسوخ و استقرار کی منزل میں داخل ہو رہا تھا۔ ذیل میں ہم الکاسانی کے حوالے سے اس منفرد منہاج تعلیم کے چند امتیازی خطوط اجاگر کریں گے۔

I: نصاب تعلیم کی عصری تقاضوں سے ہم آہنگی | دنیا بھر کی علمی اور تعلیمی ترقی اس پر شاہد ہے کہ ہر دور

کی تعلیم میں مرکز توجہ اس دور کی خاص ضرورتوں اور تقاضوں سے متعین ہوتا ہے۔ چنانچہ تاریخی لحاظ سے عہد اسلامی کے تقریباً ہر دور میں مقتضیات زمانہ کے مطابق نصاب کے عملی پہلوؤں

کو خاص اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ البتہ تمام نصابوں کی اصلی روح یہی رہی کہ ان سے دینی و دنیاوی اور علمی و عملی کا لفظی امتیاز منٹ کر ایک ایسا متوازن رویہ نمودار ہو جو زندگی کو وحدت بسیطہ کی حیثیت سے دیکھ سکے اور اسلامی زندگی کے نصب العین کی تکمیل میں بہر دور کے تمدنی تقاضوں کی رعایت کر سکے۔ الگاسانی کا عہد چونکہ سیاسی ادبار، فکری انتشار، فقہی جمود و انحطاط اور میرٹ کے زوال کا دور تھا لہذا اس عہد کے نصابِ تعلیم و تربیت میں احیائے اسلام اور ملی تشخص کی بجالی کے لیے ایک قسم کی جامعیت، توازن اور مختلف تہذیبی عناصر کی شیرازہ بندی درکار تھی۔ چنانچہ اس دور کے ہر نصابِ تعلیم اور بالخصوص کاسانی کے نصاب میں ہمیں روحِ عمر کی بھرپور جھلک نظر آتی ہے۔ چونکہ یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ زواہلِ امت کا سب سے بڑا سبب ہمیشہ زوالِ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنا ہے اور بقائے امت کا واحد وسیلہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا استحکام ہے۔ کہ

ہے دردلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم است۔ آبروے ما ز نامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم است۔

اور

ہے تاشعارِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم از دستِ رفت۔ قوم را رمز بقا از دستِ رفت

اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم و تربیت بلکہ سارے شیرازہ حیات کا مرکز و محور ہمیشہ ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو اور تعلیمی نظام میں نظریاتی طور پر نہیں بلکہ عملی لحاظ سے تعلقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی موثر صورتیں پیدا کی جائیں کیونکہ زندگی کا اسلامی اسلوب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت اور آپ کی ذاتِ پاک سے عشق کے بغیر حاصل ہونا ناممکن ہے۔

بناء بریں جب ہم الگاسانی کے نصاب و نظامِ تعلیم کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت ابھرتی ہے کہ کاسانی اپنی تعلیمی و تربیتی، افتائی اور تصنیفی و تالیفی تمام کاوشوں کا محور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنائے ہوئے ہے جیسا کہ پیچھے ادصاف کاسانی کے بیان میں سوزِ عشق کے حوالے سے بعض نمونے بیان کیے گئے تھے یہاں اس سلسلہ میں صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ موصوف بدائع الصنائع میں قدم قدم پر سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف

پہلوا جا کر کرتے ہوئے پیغام عشق کا ابلاغ کرتے جاتے ہیں۔ فقہی مسائل بیان کرتے ہوئے جہاں ذرا سی مناسبت نکلے بڑی تفصیل سے سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابندہ نقوش اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ بیہت صلوة کا بیان ہو تو صلوة الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت واضح کریں گے حتیٰ کہ صلوة استسقاء کے بیان میں بدائع کا نصف صفحہ اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوش سے جگمگا رہا ہے، احکام میت کے ضمن میں وفات رسول کی کیفیات اجاگر کریں گے اور نکاح کے مسائل کا باب ہو تو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ مہکار سے کتاب کو سجائیں گے۔ الغرض ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الکاسانی فقہ نہیں سیرت کی کتاب لکھ رہے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ فقہ و شریعت بجز سیرت و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تابندہ نقوش کے اور کسی چیز کا نام نہیں۔ بقول اقبال

مصطفیٰ برساں خویش را کہ "دین ہمہ اوست" اگر با و نرسیدی تمام بولہبی است

دراصل جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کاسانی اپنے عہد کے ہمہ گیر فکری، عملی اور اعتقادی زوال کا علاج جمال مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی کے ذریعہ کر رہے تھے جو فی الواقع ہر نوع زوال کا واحد و حقیقی مداوہ ہے خلاصہ یہ کہ الکاسانی کے نظام تعلیم و تربیت کا محور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے

۱۱ طلبہ میں ملکہ علم و تفقہ کی ترویج اور پرہم تفصیل سے بیان کر آئے ہیں حصول علم اور تعلیم کا اصل مقصد ملکہ علمی اور قوت تفقہ و استنباط کی

ترویج ہے کہ اصل میں علم نام ہی اس ملکہ کا نسخہ اور قوت ثابتہ کا ہے ورنہ محض ذخیرہ معلومات کی کوئی وقعت نہیں۔ الکاسانی خود ملکہ علم و تفقہ سے بہرہ ور عالم تھے اس لیے وہ اپنے طلبہ میں بھی علم حقیقی، قوت تفقہ اور نظر کی گہرائی و گیرائی پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلہ میں جزئیات پر انحصار کی بجائے کلیات اور قواعد کے ذریعہ تعلیم دینے کا طریقہ اپنائے ہوئے تھے جیسا کہ بدائع کے مطالعہ سے عیاں ہے۔ وہ ایسا ذہن تیار کرتے تھے جو معاملات کی ظاہری

شکل و صورت کو اختیار کرنے کی بجائے ان کے شک رسائی اور حقائق کے انکشاف کے لیے ہر معاملہ کے اسباب و علل کا کھوج لگائے اور مبادیات سے پہلے نتائج پر گہرا غور و خوض کیے حقائق و وقائع کا درست فیصلہ کرے اور اس سلسلہ میں اصل اعتبار ہر چیز کی حیثیت و کیفیت پر کرے نہ کہ اس کی کمیت و ضخامت پر یہی کشف حقیقت کا بنیادی اسلوب ہے۔

انسانوں کی تعلیم و تربیت میں دو
۱۱۱ تعلیم میں اصول تدریج و تنوع کی پاسداری :- باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ایک

یہ کہ ہر انسان ایک مخصوص مزاج رکھتا ہے پیدائش اور ماحول نیز مشاغل حیات کا اختلاف افراد کے طبائع میں اختلاف پیدا کرتا ہے لہذا سب کے لیے ایک ہی قسم کی تعلیم موثر نہیں ہو سکتی کیونکہ تعلیم و تلقین مختلف مشاغل و فرائض کے لیے آلات مہیا کرتی ہے اور دین و دنیا کے مختلف مشاغل کی انجام دہی کے لیے اشخاص بھی مختلف ہیں اور ان کے مناسب حال آلات بھی مختلف اس لیے انسانوں کی تعلیم میں ان کی مخصوص طبائع اور ان کے کمال و نقص کے درجات کا لحاظ نہ رکھنا نفع کی بجائے انہیں نقصان پہنچائے گا کہ بقول ہربرٹ سپنسر: تعلیم کا یہ بنیادی اصول ہے کہ مضمون اور طریقہ کی ترتیب قوی (انسانی) کی ترتیب، ارتقاء اور طریقہ عمل کے مطابق ہونی چاہیے۔ تربیت و تعلیم کے سلسلہ میں دوسری اہم بات اصول تدریج ہے جو فرد جس منزل حیات اور جس درجہ ارتقاء میں ہے اس کی صلاحیتیں بھی اس کے مطابق ہوتی ہیں فطرت میں ہر درجے کا قانون الگ ہے، لہذا ہر فرد کی تعلیم و تربیت میں اصول تدریج کی پاسداری بھی لازمی ہے پیٹالوزی نے سچ کہا ہے کہ: تعلیم اپنی ترتیب اور اپنے طریقوں کے لحاظ سے عقلی ارتقاء کے قدرتی عمل کے مطابق ہونی چاہیے۔ اور یقیناً الکاسانی کا نظام تعلیم و تربیت جو اسلام کے فطری اصول پر مبنی ہے، تنوع اور تدریج کے

۱۔ خلیفہ عبدالعظیم، تشبیہات روحی، ص ۱۷۱

۲۔ ہربرٹ سپنسر: فلسفہ تعلیم، اردو، ص ۱۵۶

۳۔ بحوالہ فلسفہ تعلیم، ص ۱۵۴

مذکورہ دونوں قوانین کی پوری پوری پاسداری کرتا ہے۔ اور الگاسانی کے طریق تدریس کی یہی بنیادی خوبی تھی جو اس کے پیشرو معلم رضی الدین السرخسی سے نامطمئن طلبہ کو اس قدر مطمئن بلکہ مسحور کر گئی تھی کہ وہ پورا پورا دین استاد کی غیر موجودگی میں اس کی مسند کے گرد بیٹھے منتظر رہتے اور جس وقت بھی استاد آتا وہ نہایت سکون و طمانینت اور پوری ذہنی آمادگی کے ساتھ حصول تعلیم میں منہمک ہو جائے۔

۱۷ شخصی رابطہ اور انفرادی توجہ کے ذریعہ تعلیم و تربیت :- طلبہ کی تربیت اور تعمیر شخصیت

میں استاد کی توجہ بنیادی کردار ادا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر قسم کے علم و فن کے حصول کے لیے استاد اور مرشد کی ضرورت ہے استاد کے بغیر تعلیم و تربیت کا تصور ہی ممکن نہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کی تمام درس گاہوں میں تربیت کا ایک بنیادی اصول رائج رہا ہے اور وہ ہے استادانہ تعلیم و ترتیب کے معاملہ میں شخصی رابطہ اور خصوصی انفرادی توجہ کا اصول۔ شخصی تربیت کا یہ طریقہ مسلمانوں کا ایک عام طریقہ رہا ہے جو ہر دور کے تعلیمی دستاؤں اور تربیتی خالقانوں میں پوری طرح رائج رہا۔ اس سلسلہ میں وقتی پیمانوں کی بھی کوئی قید نہ ہوتی تھی، جیسا کہ الگاسانی کے طریق تدریس کے بارے میں اوپر ہم اشارہ کر آئے ہیں وہ شخصی رابطہ اور انفرادی توجہ کے ذریعہ تعلیم و تربیت کے قائل تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے عملی تعلیم کا طریق اپنا رکھا تھا جس سے طلبہ میں علمی افادہ استفادہ کی اندرونی تحریک کو ہمیشہ قوت ملتی وہ نہ صرف نظریات و وسائل زلیست کا علم حاصل کرتے بلکہ ان میں زندگی گزارنے کا سلیقہ اور مکہ بھی پیدا ہوتا۔ کثرت و سرگرمی اور عمل کی طاقت بیدار ہوتی اور وہ متحرک و سرگرم انسان بن جاتے۔ اس ضمن میں اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی توجیہ کے طور پر الگاسانی کا یہ قول ان کے نظریہ شخصی تعلیم و تربیت کا مکمل ترجمان ہے کہ:

اخذ الیہ عند التعلیم تاکید التعلیم و تقریرہ عند المتعلم لہ

یعنی تعلیم کے وقت طالب علم کا ہاتھ پکڑ لینا دراصل انفرادی توجہ کے ذریعہ علم کو ذہن میں راسخ کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔

ثانیاً: افتاء اسلامی معاشرہ کا ہر فرد و مؤمن احکام خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے اور قوانین اسلامی کے نفاذ کا پابند ہے۔ لیکن چونکہ احکام شرعیہ پر عمل پیرائی مبنی ہے ”علم و معرفت“ پر اس لیے عمل سے پہلے احکام کا علم حاصل کرنا ہے مسلمان کا مذہبی فریضہ قرار دیا گیا ہے کہ ارشاد نبوی ہے:

”طلب العلم فریضة علی کل مسلم“

معرفت احکام کے دو ذریعے ہیں۔ ایک براہ راست مصادر شریعت یعنی قرآن و سنت کی طرف رجوع جو تعلیم یافتہ حضرات کا کام ہے اور دوسرا اہل علم سے استفعا رجوع جو عام اور ناخواندہ افراد کا فرض ہے دوسری طرف اسلام اہل علم کی ذمہ داری یہ بتاتا ہے کہ وہ دین کا علم پھیلائیں اور لوگوں کو شریعت کے مقرر کردہ حقوق و فرائض سے آگاہ کریں۔

فرمان باری تعالیٰ ہے۔

فلولا تفرق من کل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا فی

الدین ولینذروا قومہم اذ ارجعوا الیہم لعلہم یحذرون۔

احکام شریعت سے آگاہی کے لیے اہل علم کی طرف رجوع کا عمل استفعا کہلاتا ہے اور ان مسائل کا شرعی حل پیش کرنا ”مفتی“ کا کام ہے۔

اسلامی معاشرے میں مفتی کا وجود ناگزیر ہے، بلکہ فقہاء نے توجہ رستی اور ہر شہر میں ایک اہل مفتی کا وجود امت پر فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں خلیفہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اہل مفتیوں کی تیاری و تربیت اور ادارہ افتاء کی تشکیل و تنظیم کے لیے ضروری وسائل و اقدامات اختیار کرے۔

ابن خلدون کہتا ہے۔

فلخليفة تصفح اهل العلم والتدریس و سرد الفتيا

الی من هو اهل لها واعانتہ علی ذلک و منع من لیس اھلا
لہا و زجرہ لانہا من مصالح المسلمین فتجب علیہ
مراعاتہا، لئلا یتعرض لذلک من لیس لہ اھلا فیجتل الناس لہ
یعنی خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ فتویٰ تو ایس کے لیے علماء اور مد رسیدین میں سے کسی
قابل عالم کو منتخب کرے پھر اسے اس کام میں ہر ممکن سہولت مہیا کرے، نا اہلوں
کو فتویٰ نویسی سے روک دے کیونکہ افتاء مسلمانوں کے مصالح کا بنیادی ستون
ہے جس کی حفاظت و نگہداشت خلیفہ پر واجب ہے تاکہ اس منصب میں نا اہل
افراد داخل ہو کر لوگوں کو گمراہ نہ کرنے پائیں۔

افتاء کی اسی اہمیت کے پیش نظر یہ عظیم منصب اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اجتہادی
صلاحیت سے برہ ور جلیل القدر فقہاء کو سونپا جاتا رہا۔ الکاسانی اپنے عہد میں فقہ حنفی کا
اتنا عظیم مقامی ہے کہ اس دور میں کوئی فتویٰ اس وقت تک معتبر نہ سمجھا جاتا جب تک اس
پر الکاسانی، اس کی علامہ بیوی اور فقیر استاذ اسمرقندی کے دستخط ثبت نہ ہو جاتے۔ ذیل میں
ہم الکاسانی کے افتاء کی نمایاں خصوصیات اور تہذیبی ارتقاء کے عمل میں اس کی اہمیت اجاگر
کرنے کی کوشش کریں گے۔

۱۔ الکاسانی اہلیت افتاء کے تمام لازمی اوصاف سے متصف ہے

منصب افتاء پر فائز ہونے والے کے لیے فقہاء کے ام نے چار شرطیں مقرر کی ہیں
اور کاسانی میں یہ چاروں شرائط مکمل طور پر پائی جاتی ہیں۔

۱۔ اسلام - مفتی چونکہ احکام خداوندی کی روشنی میں مسائل کا حل پیش کرتا ہے اس
لیے اس کا مسلمان ہونا ضروری اور کاسانی، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، گہرے یقین اور
پر خلوص ایمان پر استقامت کی دولت سے مالا مال ہے۔ وہ ایک فقہ اور راسخ

الاتحاد مؤمن ہے۔

ب۔ عقل و فہم؛ مفتی کے لیے فہم شریعت ضروری ہے اور فہم عقل و بلوغ کا متقاضی ہے اور الکاسانی کی غیر معمولی ذہانت و فطانت و حکمت و بصیرت اور فہم و فراست کے بارے میں ہم تفصیل سے بیان کر آئے ہیں۔

ج۔ تقویٰ و اخلاص؛ دوسروں کو شریعت کی تعلیم و تلقین کرنے والے مفتی کے لیے بذات خود احکام شریعت پر عمل پیرا ہونا اور تقویٰ و عدالت سے متصف ہونا بدیہی ضرورت ہے اور جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں، الکاسانی تقویٰ و دیانت اور زہد و اخلاص کی دولت سے پوری طرح مالا مال ہے۔

د۔ اجتهاد؛ مفتی کے لیے کسی نہ کسی درجے میں اہلیت اجتهاد کا ہونا ناگزیر ہے اور الکاسانی کا پایہ اجتهاد ملکہ علم و تقویٰ اور قوت استنباط و استدلال ہم اجاگر کر چکے ہیں۔
خلاصہ یہ کہ ایک مفتی کے لیے شریعت اسلامیہ کی رو سے جن لازمی اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے، الکاسانی ان تمام اوصاف سے پوری طرح بہرہ ور ہونے کے ناطے منصب افتاء کی حقیقی اہلیت رکھتا ہے۔

۲۔ کاسانی نے فتویٰ کی بنیاد تقویٰ پر استوار کی؛ ہم شروع میں اشارہ کر آئے ہیں کہ الکاسانی نے اپنے تمام

فتاویٰ اور استنباطات میں تقویٰ و تزکیہ کے تقاضوں کو اس قدر ملحوظ رکھا ہے کہ احکام فقہیہ کی اساس ہی تقویٰ پر استوار کی ہے اور یہ کاسانی کی بہت بڑی امتیازی خوبی ہے کیونکہ عام طور سے فقہ میں فتویٰ اور تقویٰ کے مابین امتیاز کیا جاتا ہے اور پیروی احکام شریعت کو دیانتہ اور قناعت کے دو خانوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ جس کا سب سے زیادہ منفی اثر تعمیر سیرت کے عمل پر یہ مرتب ہوتا ہے کہ لوگوں میں روح قانون کی پیروی کے بجائے لفظ قانون کے تقاضوں کی تکمیل اور اس سلسلہ میں تجاوز یعنی حیلہ سازی کا رجحان ابھرتا ہے۔ الکاسانی اس منفی رجحان کو مٹانے کی خاطر اپنے ہر فتویٰ کی بنیاد تقویٰ و تزکیہ اور احتیاط کے اصولوں پر

استوار کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں چند نظائر سپلے پیش کی جا چکی ہیں، یہاں مزید ایک مثال پیش کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

رضاعت کے بیان میں کہتے ہیں۔

لا یتخبر الام علی ارضاعہ الا ان لا یوجد من ترضعہ فخبیر علیہ... لانتہ
تعالیٰ قال: لا تنصّر والدۃ بولدہا "فدل" ان الرضاع لیس علی الام.... واما
فی الفتویٰ فتفتی بانہا ترضعہ.... ولان النکاح عقد سکن وازواج وذلک
لا یحصل الا باجماعہما علی مصالح الناس ومنہا ارضاع الولد یفتی بہ لہ

یعنی ماں کو بچے کی رضاعت پر مجبور نہیں کیا جائے گا الا یہ کہ کوئی اور دودھ پلانے والی نہ ہو کیونکہ ارشاد خداوندی "لا تنصّر والدۃ بولدہا" اس پر دلالت کرتا ہے کہ ماں پر رضاعت واجب نہیں۔ لیکن فتویٰ بر بنائے تقویٰ ہی دیا جائے گا کہ ماں بچے کو دودھ پلائے اس لیے بھی کہ نکاح باہمی ارتباط و مودت پر مبنی عقد ہے اور یہ باہمی تسکین و مودت بجز اس کے حاصل نہیں ہو سکتی کہ خاوند، بیوی دونوں مصالح زریست کی تکمیل میں باہم تعاون کریں اور بچے کو دودھ پلانا بھی انہی واجب تکمیل مصالح حیات میں سے ہے لہذا اس کے لزوم کا فتویٰ دیا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ فتویٰ فقہ کے ظاہری حکم کی رو سے نہیں بلکہ ماں پر رضاعت کو لازم نہیں ٹھہراتا، بلکہ تقویٰ و اخلاص، عقد نکاح کے نفسی و روحانی تقاضوں کی تکمیل اور مصالح زریست کی تکمیل میں باہمی تعاون کے خالص اخلاقی اصولوں اور جذبات پر مبنی ہے۔ کاساتی کے فتویٰ کی اساس تقویٰ پور کھنے کے سلسلہ میں بدائع سے ایک مثال جو ہم تجھے کاساتی کے وصف تقویٰ وعدالت کے ضمن میں بیان کر آئے، یہاں اس کے پورے الفاظ کو دہرا

دینا اہل بصیرت کے لیے یقین افروز ہوگا۔

وہ کہتے ہیں۔

”لو ظهر اهل البغی علی مدینة من مدائن اهل العدل او قرية من قرایم
 وعلیو علیها فاخذوا صدقات سوائهم وعشوراراضیهم وخراجها
 ثم ظهر علیهم امام العدل لایاخذ منهم ثانیاً لان حق الاخذ للامام لاجل الحفظ
 والحماية ولم یوجد الا انهم یفتون فیما بینهم وین ربهم ان یؤدوا الزکوة والعشور
 ثانیاً لہ
 ۳۔ کاسانی مذاہب فقہیہ کے گہرے تقابلی مطالعہ کے بعد فتویٰ دیتے:

امام مالکؒ سے پوچھا گیا فتویٰ دینا کس کو جائز ہے؟ فرمایا اسے جو اختلافات علماء سے واقف
 ہو چنانچہ اس لحاظ سے جب ہم کاسانی کے علم و تعلیم، افتاء اور تصنیف و تالیفات کا جائزہ لیتے
 ہیں تو اس امر کا یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ موصوف تمام معتبر مذاہب فقہیہ کے مختلف نظریات
 مواقع اختلاف، اسباب اختلاف اور مبادئی استدلال پر گہری تقابلی نظر رکھتے ہیں اس
 لیے وہ یقیناً ہر معاملہ میں فتویٰ دینے سے پہلے تمام فقہی آراء کا تقابلی جائزہ لے کر علی وجہ البصیرت
 جس رائے کو پختہ دلائل پر مبنی، حق سے قریب تر، اور عصری تقاضوں کی تکمیل کے لیے زیادہ
 زیادہ موزوں پاتے ہیں اس کے مطابق فتویٰ صادر کرتے ہیں کہ وہ اجتہاد تہجی اور تخریجی سے
 بڑھ کر اجتہاد مذہبی کے مرتبہ پر قائل ہیں اور تہجی و تخریج کے علاوہ پیش آمدہ مسائل میں اصول
 امام کے مطابق جدید احکام کے استخراج کی بھی پوری پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں
 بدائع کے ہر صفحہ پر بیسیوں نظائر کھری ہوئی ہیں لہذا ہم قارئین کرام کو مطالعہ کتاب کی ترغیب
 پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

۴۔ کاسانی نے فتویٰ کو سماجی اور تہذیبی ارتقاء کے عمل سے وابستہ کر دیا

اسلامی معاشرہ میں افتاء کی اہمیت صرف ایک مذہبی اور تنظیمی ادارہ کی حیثیت سے

ہی نہیں بلکہ درحقیقت افتاء ایک مکمل تہذیبی عمل ہے جو مذہبی، تعلیمی، دعوتی، عدالتی اور دیگر تمام سماجی و تمدنی پہلو رکھتا ہے۔ چنانچہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل و تعمیر اور تہذیبی ارتقاء میں ایک منفی کاگر دار بنیادی اور ہمہ گیر ہے۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

سماجی عمل کی بنیاد تمام افراد و طبقات معاشرہ کے باہمی حقوق و فرائض کی حفاظت و تکمیل پر قائم ہے یہ حقوق و فرائض اسلام نے واضح طور پر متعین کر دیے ہیں لیکن حقوق کے تحفظ، فرائض کی حسن ادائیگی، اور احکام شرعیہ پر عملدرآمد کا انحصار افراد کی اخلاقی تربیت کے ذریعہ انفرادی رہنکارانہ جذبہ اطاعت اور ذمہ داری و جواب دہی کا گہرا احساس پر وان چڑھانے پر ہے اور اسلامی معاشرہ میں منفی یہ کام انجام دیتا ہے جو لوگوں کے حقوق کی پاسداری اور اپنے فرائض کی ادائیگی کا جذبہ و احساس راسخ کرنے میں بھی بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اور انکاسانی کے قتاویٰ و استنباط احکام پر نظر ڈالی جائے تو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بطور ایک منفی کے ابلاغ و تعمیم احکام سے زیادہ تعمیر سیرت اور اخلاقی تربیت کے ذریعہ روح قانون اور مقاصد شریعت کی پیروی کا باطن احسان اجاگر کرنے کو اپنا مقصد اور ملی فریضہ سمجھتا ہے، اس سلسلہ میں ہم پیچھے انکاسانی کے ادما کے بیان میں اور فتویٰ و تقویٰ کے امتزاج کے ضمن میں بدائع سے بعض نظائر بیان کر آئے ہیں۔

یہاں صرف قارئین کو ام کو بدائع جلد دوم میں خاوند اور بیوی کے باہمی حقوق و فرائض کی بحث کا مطالعہ کرنے کی دعوت دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

ب۔ معاشرہ میں اسلامی احکام پر عملدرآمد، امن و امان کے استقرار، عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد کے انہاد کے لیے تنہا قانون کا جبر اور حکومت کا ادارتی نظام کچھ نہیں کر سکتا بلکہ رائے عامہ (Positive Morality)

جو ایک قابل قدر اور ضروری احتسابی قوت ہے، معاشرتی اصلاح اور قیام عدل و انصاف اور تہذیبی ترقی میں قانون اور دیگر حکومتی اقدامات کے ساتھ برابر کا کردار

ادا کرتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے باہمی معاملات جب اخلاقی اقدار اور عدل کی راہ سے ہٹ جائیں تو اس فساد و انحلال کے خلاف اجتماعی تعمیر میں احتجاج و اضطراب پیدا ہو جاتا ہے جس سے بالآخر فساد کے عناصر کا قلع قمع ہو کر معاشرتی استقرار بحال ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مفتی لوگوں کے باہمی حقوق کی حفاظت، فرائض کی حسن ادائیگی اور تنازعات کے عادلانہ اسلامی حل تلاش کرنے کے لیے رائے عامہ کو سہوار اور اجتماعی تعمیر کو سیدار کر کے بالواسطہ طور پر سماجی استحکام اور تمدنی ترقی میں بھرپور حصہ لیتا ہے چنانچہ زیر تنقید مفتی الکاسانی اس ضمن میں اپنے عمل کی نوعیت، اہمیت اور مقاصد سے پوری طرح آگاہ ہے اور اپنے جملہ فتاویٰ سے انفرادی باطنی تعمیر کے استحکام اور اجتماعی احتسابی قوت کو فعال بنانے کا کام لے رہا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض شواہد اور بیان ہوئے ہیں اور باقی تفصیل آگے بدائع کے تجزیاتی مطالعہ کے ذیل میں آ رہی ہے۔

ج۔ اسلام سماج کی تعمیر، تمدن کے قیام اور عدل و انصاف کے استقرار میں محض جہاد قانون پر انحصار نہیں کرتا بلکہ تغیر پذیر زندگی کے معاملات سے متعلق اکثر امور مفتی اور مجتہد کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ پیش آمدہ مسائل کی خصوصی نوعیت، لوگوں کی مصالح و مسائل، حالات و زمانہ کے تقاضوں اور روح شریعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے عدل و انصاف پر مبنی بہترین اسلامی حل پیش کر سکے یہی وجہ ہے کہ مفتی کے لیے مسائل کے شہریا بستی کے رسوم و عادات، حقیقی اسلامی طرز حیات اور تغیر پذیر زندگی کے تقاضوں پر گہری نظر رکھنا ضروری ہے۔

بنارہیں معاشرے میں نفاذ قانون اور قیام عدل کے دیگر تمام عدالتی و نیم عدالتی، ادارتی و انتظامی اور سماجی و عمرانی اداروں کی دینی اور سماجی مسائل میں رہنمائی مفتی ہی کا فرض نظر آتا ہے اور یہیں سے معاشرتی نظام کے احکام اور تمدنی کی ترقی میں ایک مفتی کا بنیادی کردار واضح ہو جاتا ہے۔ ہمارے مدعو الکاسانی کے افتاء کی ایک اساسی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ملت اسلامیہ کے ہمہ گیر عہد انحطاط میں اقتداء کے عمل کو سماجی اداروں کی تعمیر و تہذیبی

عمل کے استحکام و ارتقاء اور دینی و ایمانی مقاصد کی تکمیل کے لیے بھرپور طریقے سے استعمال کیا جیسا کہ متعدد مقامات پر اس سلسلہ میں بیان کردہ شواہد و نظائر سے بخوبی عیاں ہے۔

مثالثا۔ مناظرات علمیہ: بہت شائع اور عام ہو گئے تھے یہاں تک کہ کوئی بڑا شہر ایسا نہ تھا جو مجالس مناظرہ سے خالی ہو جہاں مناظرہ کی یہ مجالس عوامی سطح پر بھی منعقد ہوتیں اور امراء و وزراء کے مجالس میں بھی۔ اکثر و بیشتر ان مناظروں کے مقاصد خالص علمی اور مذہبی ہوتے تھے مگر کبھی کبھار سیاسی محرکات بالخصوص حکمرانوں کے مفادات بھی ان کی بنیاد بن جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر مناظروں کو صرف منقہ پہلوں سے دیکھا جاتا اور ملی وحدت کے لیے مضر خیال کیا جاتا ہے جب حقیقت یہ ہے کہ علمی مناظرے نہ صرف یہ کہ تعلیمی، تربیتی اور اصلاحی لحاظ سے بھرپور افادیت رکھتے ہیں بلکہ شرعی اعتبار سے مندوب اور بعض اوقات واجب کا درجہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ الہاسانی کے تحلیل اقدار معاصر مجتہد الاسلام الغزالی علمی و فقہی مناظروں کی شرعی حیثیت اور افادیت کے بارے میں رقمطراز ہیں:

اما المحصلون فلا يتناظرون في الفروع لذلك لكن يعتقدون
وجوب المتأطرة لغرضين واستحبابها لستة اغراض، اما الوجوب
ففي موضعين: احدهما ان يحوز انه يكون في المسئلة دليل
قاطع من نص او ما في معنى النص او دليل عقلي قاطع فيما يتنازع فيه
تحقيق مناط الحكم ولو عثر عليه لا تمتنع الظن والاجتهاد فعليه
البياحثة والمناظرة حتى ينكشف انتفاء القاطع الذي يات
ويعصى بالغفلة عنه - الثاني ان يتعارض عنده دليلان
ويعسر عليه الترجيح فيستعين بالبياحثة على طلب
الترجيح واما الندب ففي مواضع: الاول، ان
يعتقد فيه انه معاتد فيما يقوله غير معتقد له وانه

انها يخالف حدا او عنادا او نكرا فيناظر ليزيل
 عنهم معصية سوء الظن ويبين انه يقول عن اعتقاد
 واجتهاد - الثاني، ان ينسب الى الخطاء وان قد خالف
 دليلا قاطعا فيعلم جهلهم فيناظر ليزيل عنهم
 الجهل كما ازال في الاول معصية التهمة، الثالث،
 ان ينبه الخصم على طريقه في الاجتهاد حتى اذا فسد ما عنده
 لم يتوقف ولم يتخير وكان طريقه عند اعتياد ايرجع اليه اذا فسد
 ما عنده وتغير فيه ظنه - الرابع: ان يبتعد ان مذهبها اثقل واشد وهو
 لذلك افضل واجزل ثوابا فيسعى في استجراار الخصم من الفاضل ومن
 الخلق الى الاحق - الخامس: انه يفيد المستمعين معرفة طرق الاجتهاد
 ويثقل لهم مسلكتهم ويجرك دواعيهم الى نيل رتبة الاجتهاد ويهدى بهم
 الى طريقة نيكون كالمعاونة على الطاعات والترغيب في
 القربات - السادس وهو لاهم وهو ان يتفهد هو وخصمه تدليل
 طرق النظر في الدليل حتى يترقى من الظنيات الى ما الحق فيه واحده
 الاصول فيحصل بالمناظرة نوع من الارتياب وتضييد الخاطر و
 تقوية المنة في طلب الحقائق ليترقى به الى نظر هو فرض عينه ان لم
 يكن في البلد من يقوم به او كان قد وقع الشك في اصل من الاصول
 او الى ما هو فرض على الكفاية او لا بد في كل بلد من عالم على
 يكشف معضلات اصول الدين وما لا يتوصل الى الواجبات
 به فهو واجب متعين وان كان اليه طريق سواء فيكون هو احدي
 خصائل الواجب فهذا في بعض الصور يلحق بالمناظرة الواجبة -
 له

یعنی حقیقی اہل علم حضرات فرود فقہیہ میں سبھی اغراض کی خاطر مناظرے نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک دو صورتوں میں مناظرہ کرنا واجب اور چھ صورتوں میں مستحب ہے و جب مناظرہ کی دو صورتیں یہ ہیں۔

۱۔ کسی معاملہ میں منصوص یا معقول دلیل قطعی موجود ہو لیکن کوئی عالم اس دلیل ناواقف ہونے کی بنا پر ظن و اجتہاد سے کام لیتا ہو جو کہ ناجائز ہے تو اس صورت میں دلیل قاطع کے اثبات یا نفی کے لیے مناظرہ کرنا واجب ہے۔

۲۔ وجوب مناظرہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ کسی معاملہ میں فقہیہ دو دلیلوں کو متعارض سمجھے اور ان میں کسی کو ترجیح نہ دے پائے تو مناظرہ و مباحثہ سے اس ترجیح کے سلسلہ میں مدد لینا واجب ہے۔

استحباب مناظرہ کی صورتیں مندرجہ ذیل ہوں۔

۱۔ کسی عالم کے بارے میں اگر لوگ یہ گمان رکھتے ہوں کہ وہ محض حسد و عناد کی بنیاد پر اپنے موقف پر مصر ہے تو اس اس غلط فہمی اور سوئے ظن کے ازالہ کے لیے مناظرہ کرنا مستحب ہے تاکہ وہ جرم اہتمام سے بچ جائیں۔

۲۔ یا یہ کہ لوگ اس عالم پر قطعی دلیل سے ناواقفیت کا الزام لگائیں اور اس سلسلہ میں وہ خود غلطی پر ہوں تو ان کی اس غلطی اور جہالت کے ازالہ کے لیے مناظرہ کرنا مندوب ہے۔

۳۔ اس فرض سے مناظرہ کرنا کہ فریق مقابل اپنے طریق استدلال کی غلطی پر متنبہ ہو کہ درست طرز استدلال کو اپنالے۔

۴۔ اس اعتقاد کے ساتھ مناظرہ کرنا کہ میرا فقہی مذہب شدت و حریمت پر مبنی ہونے کی وجہ سے افضل اور زیادہ ثواب کا ذریعہ ہے لہذا فریق مقابل میرے مذہب کی طرف رجوع کر لے تاکہ فضیلت اور زیادہ ثواب کا استحقاق پائے۔

۵۔ سامعین کو اجتہاد و استنباط کے طرق سے آگاہ کرنے اور اہلیت اجتہاد کے حصول کا داعیہ اہل علم کے لیے مناظرہ کرنا ایسا ہوگا جیسا کہ نیک کاموں میں ہانکی مدد کرنا۔

۶۔ مناظرہ کا اہم اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہر دو فریق دلائل شرعیہ میں غور و فکر اور نظریات سے بلند ہو کر کلیات تک رسائی کی استعداد پیدا کرنے میں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھائیں یوں یہ مناظرہ ذہنی و فکری ریاضت، قوائے قلبیہ کی تقویت اور حقائقِ حسی کی خواہش و اہلیت کے حصول کے ذریعہ تعلیم دین کے فرض عین یا فرض کفایہ کی تکمیل کا وسیلہ ٹھہرے گا اور واجب کا ذریعہ بھی وجوب کا درجہ رکھتا ہے لہذا اس آخری غرض کے لیے مناظرہ کرنا بعض صورتوں میں واجب ہوتا ہے۔

حجۃ الاسلام الغزالی کے اس بیان کے مطابق حقیقی علماء کے علمی و فقہی مناظرے تمام سلبی نتائج سے قطعاً مبرا ہوتے ہیں اور مختلف تعلیمی، تربیتی اور اصلاحی مقاصد کی تکمیل کی خاطر وجوب و استحباب کی شرعی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ الغزالی کا تحلیل القدر۔ معاصر فقہیہ انکاسانی اپنے تمام مناظرات و مباحثات میں غزالی کے بیان کردہ مقاصد و فوائد کو یقیناً پیش نظر رکھتا تھا بلکہ بدائع الصنائع کی روشنی میں کاسانی کے افکار و احساسات اور اس کے مناظرات کا جائزہ لینے پر یہ حقیقت ابھرتی ہے کہ موصوف کے فقہی و کلامی مناظروں کی نوعیت خصوصیات اور فوائد غزالی کے پیش کردہ امور سے بھی فائق اور زیادہ ہیں۔ سطور ذیل میں مناظرات کاسانی کا ایک عمومی اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ تعلیمی و تربیتی نظام کی آبیاری، فقہی و کلامی ارتقاء اور استقرار تمدن میں موصوف کی خدمات کا یہ پہلو بھی اجاگر ہو سکے۔

عہد کاسانی کے علمی مناظروں
مناظرات کاسانی کی نوعیت و خصوصیات: عمومی نوعیت تو تمدنی

و ثقافتی ماحول اور علمی و تمدنی کیفیت کے حوالے سے ہی متعین ہوتی ہے کہ ایک طرف یہ تمدنی انحطاط کا عہد تھا اور دوسری جانب علمی و فقہی مناظرے اس قدر شائع اور عام ہو گئے تھے کہ ہر بڑے شہر میں عوامی و سرکاری سطح پر تقریباً ہر روز مجلس مناظرہ منعقد ہوتی رہتیں ایسے میں اغلباً مناظرے ”عوامی نوعیت“ اختیار کر گئے تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عام طور پر ان مناظروں میں فنی ضوابط اور مجلسی آداب کم ہی ملحوظ رکھے جاتے لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ ہر علمائے مناظرے ہمیشہ ”علمی نوعیت“ کے اور ضوابط و آداب کے پابند

ہوتے۔ چنانچہ الکاسانی کے مناظرے ہمیں حسب ذیل نوعیت اور خصوصیات کے حامل نظر آتے ہیں۔

۱۔ الکاسانی شدید ضرورت کے وقت ہی مناظرہ میں حصہ لیتے ہیں۔

مناظروں اور مباحثوں میں شرکت کو روانہ نہیں رکھتے الا یہ کہ کوئی انتہائی حساس اور بنیادی ایمانی مسئلہ زیر بحث ہو۔ چنانچہ ایسے دور میں جب کہ ہمدرد صبح سے شام تک بیسیوں مجالس مناظرہ منعقد ہوتی ہیں الکاسانی کی صرف دو یا تین مناظروں میں شمولیت اور وہ بھی فریق مقابل کے انتہائی اصرار پر، اس امر کی شاہد ہے کہ موصوف ایک نہایت سنجیدہ اور متین عالم دین ہیں جو حصول شہرت یا جاہ طلبی کی خاطر عوامی نوعیت کے مباحثوں میں خواہ مخواہ حصہ لینے کے روادار نہیں بلکہ صرف اسی وقت مناظرہ کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں جب خاص دینی یا تربیتی اور اصلاحی مقاصد کی خاطر مناظرہ شرعی طور پر واجب یا استحباب کا درجہ رکھتا ہو یا پھر فریق مقابل شدید اصرار کر کے انہیں مناظرہ کرنے پر مجبور کر دے اور اس صورت میں بھی وہ مجادلہ برائے مجادلہ سے ہر ممکن احتراز کرتے ہیں چنانچہ روایت ہے کہ جب الکاسانی دمشق پہنچے تو وہاں کے علماء آپ سے مناظرہ کے لیے آئے اور اس سلسلہ میں آپ کو آمادہ کرنے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس مسئلہ میں گفتگو نہیں کروں گا جس کی طرف کوئی ایک بھی امام ابوحنیفہ کے اصحاب میں سے گیا ہوگا انہوں نے بہت سے مسائل بیان کیے مگر آپ نے ایک ایک کے بارے میں تفصیل سے ثابت کر دیا کہ اس کی طرف امام اعظم کے خلاف فلاں اصحاب گئے ہیں پس اسی پر مناظرہ ختم ہو گیا۔ اس سے عیاں ہے کہ الکاسانی بلا ضرورت مناظرہ نہ کرتے اور اگر مجبوراً مناظرہ کرنا بھی پڑتا تو غیر ضروری بحث سے احتراز کرتے البتہ حساس دینی اور اعتقادی مسائل میں آپ ایک ثقہ اور راسخ العقید عالم کی حیثیت سے معتزلہ، اہل بدعت اور دیگر بدعتیوں اور

گردوہوں کا شدید رد کرتے رہتے کیونکہ اس صورت میں باطل کی تردید شرعاً واجب ہے

۲۔ الکاسانی کے مناظرے وسعت و جامعیت کی شان لیے ہوئے۔

بنیادی طور پر الکاسانی کے مناظرے فقہی، اصولی یا کلامی نوعیت کے ہوتے تھے چنانچہ تاریخ میں ان کے ایک فقہی اور ایک اصولی مناظرے کی روداد ملتی ہے جب کہ اعتقاد ہی مستقل کتاب ”السلطان المسین فی اصول الدین“ بھی تصنیف فرمائی۔ لیکن عمیق تجزیہ کرنے سے الکاسانی کے توسیعی اور جامعیتی مزاج کی جھلک ان کے مناظروں میں بھی مل جاتی ہے کہ ان کا ہر مناظرہ علمی لحاظ سے تنوع، وسعت معلومات اور گہری تنقیدی بصیرت کا آئینہ دار ہے وہ جس طرح اپنی تصانیف میں ہر معاملہ کو اس کے تمام پہلوؤں اور اسرار و ابعاد سمیت بیان کرتے ہیں اسی طرح مناظروں میں بھی مسئلہ زیر بحث کے تمام موضوعی اور فنی رخ پیش نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ اپنے اصولی اور فقہی مناظروں میں وہ فریق مقابل پر سبک و وقت روایتی، درایتی اور نفسیاتی زاویوں سے حملہ آور ہوتے ہیں جس سے ان کے خصم مرعوب ہو کر اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو کر فوراً شکست تسلیم کر لیتے ہیں۔

۳۔ الکاسانی مناظروں میں ٹھوس علمی اصولوں، فنی ضوابط اور مجلسی آداب کی پابندی کرتے

الکاسانی کی شخصیت اصول پسند، جمالیات و نفاست کی دلدادہ، خودداری و خود اعتمادی سے سرشار، تنظیم و تربیت کی جوگر اور ثبات و استقلال سے بہرہ ور ہونے کے ناطے زندگی کے ہر معاملہ میں ان طبعی اوصاف کی پابند ہے۔ چنانچہ الکاسانی کے مناظرے میں بھی ہمیں ان اوصاف کو بھرپور جھلک نظر آتی ہے۔ وہ ہر مناظرے میں از ابتدا تا انتہا طے شدہ علمی اصولوں، مباحثہ وہ مناظرہ کے فنی ضوابط اور عام تمدنی و مجلسی آداب کی خود بھی پوری پوری پابندی کرتے ہیں اور اپنے فریق مقابل سے بھی بجا طور پر اس کی توقع رکھتے ہیں۔ اوپر دمشق میں ہونے والے ایک فقہی مناظرے کی مختصر

روداد بیان ہوئی جس سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ الگاسانی مناظرہ میں حصہ لینے سے پیشتر مناظرہ کی حدود، دائرہ بحث اور طریق کار کا تعین کرتے ہیں اور موضوع مناظرہ پر بحث سے پہلے مسئلہ عمومی حقائق کی وضاحت کرتے ہوئے مرحلہ بہ مرحلہ آگے بڑھتے ہیں اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ فریق مقابل شروع ہی سے معاندانہ روش ترک کر کے افہام و تفہیم اور قبول حق کے جذبہ سے بحث کرتا ہے اور جس مرحلہ پر بھی اختلاف کا حقیقی نقطہ اتفاق رائے سے طے ہو جائے نہایت خوش اسلوبی سے پرسکون ماحول میں مناظرہ اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ دمشق کے فقہی مناظرے میں ہوا کہ الگاسانی موضوع بحث کے تعین کی خاطر مسلمہ عمومی حقائق پر مد مقابل علماء کو ساکت و قائل کرتے کرتے اس مقام پر لے آئے جب ان کے پاس مزید کوئی سوال یا اختلافی نقطہ ہی نہ بچا اور یوں الگاسانی نہایت اطمینان سے میدان مناظرہ اور ساتھ ہی فریق مقابل کا دل بھی جیت گئے۔

۴۔ الگاسانی کے مناظرے غیرت ایمانی اور حمیت مذہبی کی اہمیت دار میں

تیسرے اوصاف الگاسانی کے ضمن میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ موصوف کی خودداری و خود اعتمادی کا نمایاں مظہر ان کی غیرت ایمانی اور حمیت مذہبی ہے جس کا انکاس ان کے تربیتی و تعلیمی نظام فقہی اصولی تصانیف، شرعی فتاویٰ اور علمی مناظروں سبھی میں بہت واضح اور نمایاں ہے چنانچہ سلجوقی دربار میں اصول فقہ کے معروف مسئلہ تصویب مجتہد پر ایک مناظرے کے دوران اپنے خصم کی جہالت بھٹائی اور ہٹ دھرمی کے مقابلے میں الگاسانی نے اپنی غیرت ایمانی اور حمیت مذہبی کا بھرپور عملی مظاہرہ کیا اور اس سلسلہ میں سلطان کا خوف، دربار سے وابستگی برقرار رکھنے کی خواہش اور جاہ و مال کی محبت وغیرہ ایسے وقتی محرکات و عوامل ان کی خودداری و خود اعتمادی اور غیرت ایمانی و حمیت مذہبی پر ذرا بھی غالب نہ آسکے جو ان کی عظمت کو درکار کا بین ثبوت ہے۔

مناظرات الگاسانی کے مقاصد و فوائد | اوپر ہم کہہ آئے ہیں کہ الغزالی نے ایک حقیقی
دیرینہ مقاصد بیان کیے ہیں الگاسانی اپنے صحابہ فقہی، اصولی اور کلامی مناظروں میں یقیناً ان تمام

مقاصد و فوائد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اور ان کے علاوہ کچھ اور تعلیمی اور اصلاحی مقاصد کی تکمیل کے لیے بھی مناظروں کو استعمال کرتا ہے۔ ہم ذیل میں انتہائی اختصار کے ساتھ مناظرات کا سانی کے چند نمایاں مقاصد و فوائد کا عمومی تذکرہ کرتے ہیں۔

۱۔ قواعد ذہنی کی تہذیب اور بالیدگی | مقاصد تعلیم کے سلسلہ میں پیشاوردی

Education is a natural harmonious and progressive development of man's innate powers. یعنی تعلیم انسان کی تمام طبعی صلاحیتوں کا فطری

سلسلہ اور ہم آہنگ ارتقاء ہے، سے عیاں ہے کہ تعلیم و تربیت کا ہر براہ راست اور بالواسطہ ذریعہ انسان کے قواعد ذہنی کی بالیدگی اور نشوونما میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے علمی مناظرہ و مباحثہ بھی یقیناً نظام تعلیم و تربیت کا ایک حصہ ہے لہذا اس کا مقصد بھی قواعد انسانی کی تہذیب اور بالیدگی ہے جیسا کہ الفزالی نے بھی اس کی تصریح کی ہے کہ:

فيحصل بالمناظرة نوع من الدتياض وتشعید الخاطر وتقوية المنة في طلب الحقائق ليترتق به الى نظر هو فرض عينه۔ لہ

بناء بریں یہ یقینی امر ہے کہ الکاسانی جو بنیادی طور پر ایک ماہر تعلیم اور مدرس و مربی ہے دیگر تمام ذرائع تعلیم کی طرح مناظروں سے بھی اپنی، فریق مقابل کی اور ہامعین و حاضرین کی قواعد ذہنی و فکری کی تہذیب و تشخیز اور ارتقاء و بالیدگی کا کام لیتا ہے جیسا کہ مناظرات کا سانی کی نوعیت و خصوصیات کے ضمن میں اس حقیقت کی طرف اشارے کیے جا چکے ہیں۔

۲۔ ملکہ علم و تفقہ کا رسوخ | ملکہ علم و تفقہ کی توسیع کے لیے مناظرہ کی افادیت مسلم ہے۔ ابن خلدون کہتا ہے، ملکہ پیدا کرنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ طلباء کثرت کے ساتھ علمی مسائل میں باہمی مذاکرے اور مناظرے کرتے رہیں اس طرح بہت جلد ہی ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اور طالب علم باہر فن بن جاتا ہے۔ لہ

غزالی کے بیان میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں: اور اس امر کا یقین کرنے کے کافی شواہد موجود ہیں کہ جس طرح الگاسانی کی ذات میں ملکہ علم و تفکر اور قوت استدلال و استنباط کے رسوخ میں زمانہ طالب علمی کے مباحثوں اور مذاکروں نے بنیادی کردار ادا کیا تھا اسی طرح وہ بطور ایک مفتی و مدرس کے اپنے علمی و فقہی مناظروں سے طلبہ عوام اور علماء میں بصیرت اور ملکہ استنباط کی تربیح کے مقاصد حاصل کرتے رہے اور یوں بالواسطہ طور پر طاعات میں معاونت کے ذریعہ اجر و ثواب کا استحقاق حاصل کرتے رہے ہیں۔

۳۔ مختلف افکار و نظریات کا تنقیدی اور تقابلی مطالعہ | علمی مناظرہ کا ایک

کہ اس سے فریقین کو ایک دوسرے کے علمی نظریات، فقہی آراء، اصولی افکار اور کلامی اعتقادات کے گہرے تنقیدی اور تقابلی مطالعہ موقع ملتا ہے جس سے ایک طرف تو نظریں وسعت اور گہرائی و گیرائی پیدا ہوتی ہے اور دوسری جانب دلائل کی روشنی میں نظریات سے نکل کر قطعیت و یقینیت کے دائرے میں داخل ہونے اور غلط نظریات کو چھوڑ کر حق کی جانب رجوع کرنے کی توفیق میسر آتی ہے اور یقیناً الگاسانی کے مناظروں کا ایک بنیادی مقصد مختلف مذاہب فقہیہ کی آراء اور اصولی تصورات نیز مختلف کلامی نظریات کا گہرا تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ بھی رہا ہے جس سے خود کاسانی نے بھی اپنے نظریات کی تشکیل میں بھرپور فائدہ اٹھایا جیسا کہ بدائع کے مطالعہ سے پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے اور اپنے خصوم کو بھی پورے پورے استفادہ کا موقع فراہم کیا اور ساتھ ہی عوام بھی مختلف مذاہب کے نابین موازنہ اور محاکمہ کے ذریعہ فطرت حق سے قریب تر اور اجر و ثواب کے اعتبار سے بہتر اور افضل مذاہب کے اختیار کا شعور و احساس بھی دیا۔

۴۔ حق کی طلب و قبول کے شعور اور داعیات کی تعمیم | علمی مناظرات اور بالخصوص

اعتقاد دینی اور ایمانی مسائل پر مناظرات کا بنیادی مقصد یہ ہوا کرتا ہے فریقین باہم مل کر دلائل عقلم و نقلیہ اور خلائق و اقلیہ کی روشنی میں حق کی جستجو کریں اور جب حق و دوست موقف

بالا اتفاق ثابت اور طے ہو جائے تو دونوں فریق مشرح صدر کے ساتھ مطلق نظریات سے رجوع کر کے حق کو قبول کر لیں ہمارے ممدوح الکاسانی کے کلامی اور اصولی مناظرات کا بھی ایک مقصد ہمیشہ یہ رہا کہ وہ عوام اور فریق مناظرہ کے دل میں یہ احساس جاگزیں کر دیں کہ مناظرہ حقیقت کا ایک ذریعہ ہے اور انکشاف حقیقت پر اس کا قبول کر لینا سب کے لیے ضروری ہے اس معاملہ میں کاسانی اس قدر حساس ہے کہ اس کے نزدیک خطا و لغزش خواہ فکری اور اعتقادی ہو یا لغوی اور عملی ہر آئینہ حتی الامکان واجب الاحترام اور جائزہ مؤاخذہ ہے اس لیے وہ لوگوں کو ہر قدم پر فکری اور عملی خطا اور سہو سے بھی بچنے اور حق و راستی پر ثابت قدم رہنے کی تاکید کرتا ہے، وہ کہتا ہے:

التحرز عن فعل (المخطيء) ممكن في الجملة وحفظ النفس عنه
مقدور فكان جائزاً المواخذة عليه لكن الله تعالى رفع
المواخذة عليه رحمة وفضلاً - بركة دعاء النبي صلى الله عليه
وسلم له ولهذا يجب الاستغفار والتوبة عن فعل المخطيء والنسيان له
يعني خطا اور نسيان سے احتراز ممکن ہے لہذا اس پر مؤاخذہ بھی جائز ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے
اپنے فضل و کرم اور دعائے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمت سے مؤاخذہ اٹھایا لیکن خطا اور نسیان
کے عمل سے ہمیشہ توبہ اور استغفار کرتے رہنا واجب ہے۔

یہ تین علامہ ابوبکر بن مسعود الکاسانی کی چند اساسی دینی و عملی خدمات جو انہوں نے چھٹی
صدی ہجری کے عہد پر آشوب میں رب کریم کی توفیق و عنایت اور خدا داد جذبہ و استعداد
کے سہارے انجام دیں اور جن کے ذریعہ اسلام کی دینی اقدار کے فروغ و استحکام اور تہذیبی تشخص
کے استقرار میں نمایاں کردار ادا کیا لیکن تعلیم و تربیت، افتاء و اجتہاد اور مناظرہ و مباحثہ کے

علاوہ ملک العلماء الکاسانی کا سب سے اہم اور نمایاں کارنامہ تصنیف و تالیف ہے جو
 فی الواقع ان کی فکر و استعداد کا اصل میدان اور ان کی تہذیبی و ملی خدمات کا حقیقی آئینہ ہے۔
 بناء بریں ملک العلماء الکاسانی کی تصنیفی خدمات کا جائزہ ایک مستقل مضمون کا متقاضی
 ہے جسے ہم آئندہ کسی فرصت پر اٹھا رکھتے ہیں۔

وبالله التوفیق وهو المستعان
